چلتے پھرتے چہرے



راجندر سنگھ بیدی

چلتے پھرتے چہرے

راجندر سنگھ بیدی کی دیگر کتب

۱۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

۲۔ بے جان چیزیں

۳۔ سات کھیل

۴۔ کندن

۵۔ بیدی کے افسانے

ناشر ـــــــ سرفراز احمد۔

مطبع ـــــــ منظور پریس لاہور

[redacted] ـــــــ [redacted]

چلتے پھرتے چہرے

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

فہرست

نریش کمار شاد

راجندر سنگھ بیدی سے انٹرویو

"کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں —" نئی دِلّی کے ایک ریسٹورنٹ کی حسین فضا میں کافی کے پیالے کو لبوں تک لاتے ہوئے میں نے پوچھا — کہ "شاعر اور فن کار کا طبقاتی رجحان اُس کے فلسفہ حیات کا پتا دیتا ہے"، بیدی کی روشن آنکھوں میں جیسے کوئی چمکیلی سی لہر دوڑ گئی اور وہ کہنے لگے :" ضرور پتہ دیتا ہے۔ کیونکہ انسان ایک فرد بھی ہے اور سماج کا حِصّہ بھی اور دونوں کا ایک دوسرے پہ ردِّ عمل ہوتا ہے جس میں فرد فرد نہیں رہتا اور سماج سماج نہیں رہتا۔"

" اور کیا آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں —" میں نے کافی کی پیالی کو خالی کرتے ہوئے کہا،" کہ اُردو کے بعض افسانہ نگاروں کے بعض افسانے اگرچہ پریم چند کے بعض افسانوں سے بہتر ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے کوئی افسانہ نگار پریم چند سے بڑی قامت کا نہیں۔"

"نہیں۔" بیدی نے بلا تامل جواب دیا "میں اسے تسلیم نہیں کرتا" اور پھر کچھ سوچ کر اپنی بات آگے بڑھائی "میرے خیال میں پریم چند اُسی طرح بڑے افسانہ نگار ہیں جس طرح ہر بیٹے کا باپ بڑا ہوتا ہے۔ لیکن باپ اگر انٹرنس تک پڑھا ہے تو بیٹا ایم۔ اے پاس کر سکتا ہے" اتنا کہہ کر بیدی نے بھی اپنی کافی کی پیالی خالی کر دی اور خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا "پریم چند کے افسانوں میں نفسیاتی حقائق کھُل کر سامنے نہیں آتے۔ فارم کے اعتبار سے بھی بعد کے افسانہ نگاروں نے اُن سے بہتر تجربے کئے ہیں۔ اگر یہ بھی ایک کلیہ ہے کہ ادیب اپنی بہترین تخلیق سے پہچانا جا سکتا ہے تو اُن کے بعد کے افسانہ نگاروں کے بہترین افسانے ان کے بہترین افسانوں سے بہتر ہیں بیسوی صدی کے انسان کا وہ ذہنی خلفشار ان کے یہاں نہیں ملتا جو منٹو، عصمت اور کرشن کے ہاں ملتا ہے۔ میرے نزدیک پریم چند کا ادب ایک بھلے آدمی کا مہانتائی ادب ہے" آخری جملہ کہتے ہوئے بیدی کی ذہین آنکھوں میں مسکراہٹ کے جگنو ٹمٹمانے لگے۔ میں بھی ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے ہی میں نے سوال کیا "یہ بات تو غالباً آپ کو خود بھی اپنے لئے باعث فخر معلوم ہوتی ہوگی کہ اپنے دوسرے ہم عصر افسانہ نگاروں کی نسبت آپ کی فکر میں زیادہ گہرائی ہے اور آپ کا تصورِ حیات زیادہ واضح، زیادہ پختہ اور زیادہ وسیع ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کیا آپ کو اس امر کا بھی احساس ہے کہ ــــــ"

"ہاں، ہاں آگے کہئے" بیدی صاحب نے سنجیدگی سے اپنی میٹھی میٹھی نظر مجھ پر

ڈالتے ہوئے کہا اور میں نے جھجکتے جھجکتے اپنی بات یہ کہتے ہوئے پوری کر دی۔
"آپ کا اندازِ بیان بہت خشک اور تھکا دینے والا ہوتا ہے اور اس میں آپ ہی کے بعض ہم عصر افسانہ نگاروں مثلاً منٹو اور کرشن کے اندازِ بیان کی سی دل کشی اور برجستگی نہیں ہوتی۔" بیدی صاحب کچھ متفکر اور چُپ چُپ سے ہو گئے تو میں نے کہا "معاف کیجئے، بیدی صاحب! شاید میں یہ سوال مناسب اور شائستہ پیرائے میں نہیں کر سکا یا شاید مجھے ایسا سوال ہی نہ کرنا چاہیئے تھا۔"
"نہیں نہیں" بیدی صاحب کی آنکھوں سے جیسے پھر میٹھی میٹھی شبنم ٹپکنے لگی۔
"ایسی بات نہیں ہے۔ آپ اس وقت جو جی میں آئے، جس ڈھنگ سے چاہیں پوچھ سکتے ہیں" اور پھر پان کا بیڑہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولے "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کے اس خیال سے اتفاق کر لوں کہ مجھ میں زیادہ دُور رسی اور تخلیق ہے تو میں اسے محض آپ کی رائے سمجھوں گا اور دوسری یہ بات کہ میری تحریر خشک اور پیچ دار ہوتی ہے تو اسے واقعی تسلیم کر لوں گا۔"
"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ فلسفیانہ اندازِ بیان بنیادی طور پر خشک اور پیچ دار ہوتا ہے۔" میں نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"نہیں، یہ بات نہیں ہے" بیدی بہت متانت سے کہنے لگے "بات یہ ہے کہ میرے اندر کا فن کار آغازِ شوق میں جب ادبی دنیا میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس وقت میں زبان کے سلسلے میں بنیادی CONCIOUS

نہیں تھا۔ اسی لئے میری ابتدائی تحریروں میں زبان وبیان کے کافی اسقام ملتے ہیں لیکن میرے خیال میں میری بعد کی تحریروں میں تھکا دینے والا اندازِ بیان نہیں ہے کیونکہ اب میں نے مقدّس اور معرب الفاظ کا دامن شعوری طور پر چھوڑ دیا ہے، جس کے لئے مجھے فلم کا ممنون ہونا چاہیئے میں فلموں میں مکالمے لکھتا ہوں اور مجھے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سمجھانا ہوتا ہے اس لئے اس سے نہ صرف میری زبان سہل ہوئی بلکہ ایک ہی جذبے کو بہت سے مختلف طریقوں سے دوسروں کو سمجھانے میں میری مشق بھی ہوگئی۔"

بیدی صاحب کی یہ بات سُن کر بے اختیار میری زبان سے نکلا "فلمی دنیا سے وابستگی نے زبان کو سہل کرنے کے علاوہ آپ کے ادب پر کیا کوئی اور اثر نہیں ڈالا؟"

"ضرور ڈالا ہے،" بیدی صاحب نے کہا "سب سے بڑی چیز جو میرے ادبی مزاج نے فلمی دنیا سے قبول کی ہے، وہ ہے ایک منظر کو اُس کی پوری وسعت کے ساتھ خود دیکھ سکنا اور پھر اُسے دوسروں کو بھی دکھا سکنا۔ اس کے علاوہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرنے کا ہنر بھی میں نے فلم ہی سے سیکھا ہے۔ کیونکہ فلم میں آپ کا ایک جملہ بھی سلولائڈ کے سو فٹ پر پھیل سکتا ہے جس کی قیمت ایک ہزار روپے سے ایک لاکھ روپئے تک ہوسکتی ہے اس لئے فلم میں آپ غیر ضروری باتیں نہیں لکھ سکتے۔ اور پھر مصوّری جو فلم آرٹ ہی کا ایک حصّہ ہے اُس نے بھی مجھ پر بہت اثر کیا ہے۔"

"مصوّری ــــ" میں سوالیہ نشان بنتے ہوئے بولا "اور وہ بھی فلمی مصوّری آپ

کے ادب پر کیونکر اثر انداز ہوئی؟"

" مثال کے طور پر جارج ایلیٹ کی سی ادیبہ غروبِ آفتاب سے متعلق آٹھ صفحے لکھ سکتی تھی لیکن آج کا ادیب غروبِ آفتاب کا منظر بیان کرنے کے لئے چند جملے ہی استعمال کر سکتا ہے اور اُس کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ کہانی کا جز و لاینفک ہوں یعنی ان میں کہانی کا بنیادی میلان جھلکتا ہو" اور میری متعجب نگاہوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بیدی صاحب نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کر دی" اس کی مثال اپنی ایک تحریر سے دیتا ہوں "ایک چادر میلی سی" کے آغاز میں آفتاب کا ذکر کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ بجائے خود اُس سے ایک تصویر سی بنتی ہے اور قاری کا ذہن کہانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے" اور اتنا کہنے کے بعد کسی پسندیدہ شعر کی طرح بیدی صاحب نے یہ جُملے فرفر زبانی پڑھ دیئے:

" آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی۔ آج آسمان کے کوٹلے پر کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس پر خون کے چھینٹے نیچے لکا تن پر پڑتے ہوئے تلو کے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔"

" ان ابتدائی جملوں نے ایک خوں آشام منظر سے قاری کے ذہن کو اس بات کے لئے چوکنا کر دیا ہے" بیدی خلا میں دیکھتے ہوئے کہنے لگے" کہ وہ ایک کریہہ (GRIM) کہانی پڑھنے والا ہے، جس میں خون اور قتل کی باتیں ہوں گی اس منظر کو کوٹلے سے متعلق کرتے ہوئے میں کوٹلے کو آسمان پہ لے گیا ہوں، جیسے یہ بجلی آسمان سے گرنے

والی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قضا وقدر کے ہاتھوں انسان کتنا مجبور ہے، علاوہ اُن مجبوریوں کے جن کا ذمہ دار ہمارا معاشرہ ہے ایبسٹریکٹ پینٹنگ میں جیسے مصوّر ایک بھوکے آدمی کے پیٹ پر آنکھ بنا دیتا ہے اُسی طرح کی نقاشی، "ایک چادر میلی سی" کے آغاز میں ہے۔"

"بے شک" میں نے بیدی کی ذہین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے "یہ فرمایئے کہ ایک افسانہ نگار اور ایک عام آدمی میں بُنیادی طور پر آپ کو کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟"

بیدی نے بہت بے تکلفی سے جواب دیا "افسانہ نگار کو چلتے چلتے رستے کے کسی موڑ پر افسانہ مل جاتا ہے لیکن عام آدمی اُس موڑ کو ٹھوکر لگاتے ہوئے بے نیازی سے آگے بڑھ جاتا ہے" اور پھر تھوڑی سی دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگے "پیدائشی افسانہ نگار ہونا کوئی حقیقت نہیں۔ افسانہ نگار کی بنیادی خوبی کا احساس ہوتا ہے خواہ پیدائشی طور پر حساس ہو یا کسی عصبی بیماری کی وجہ سے۔ باقی سب عرق ریزی اور مشق ہے افسانہ نگار کا پیشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ اُسے گفتگو کے کسی فقرے یا رستے کے کسی موڑ پر افسانہ دکھائی دے جاتا ہے لیکن دوسرے آدمی کو اُس کا احساس نہیں ہوتا۔ جیسے یہ صرف ایک موچی ہی کو احساس ہو سکتا ہے کہ سامنے گزرتے ہوئے بابو کے بوٹ میں پتاوا نہیں ہے،" اتنا کہتے کہتے بیدی کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھالر تن گئی "اگرچہ افسانہ نگار اور موچی کی مماثلت کافی بھونڈی ہے۔"

موچی والی بات سے خود بھی محظوظ ہونے کے بعد میں نے پوچھا "بیدی صاحب

کیا آپ اپنی کسی ادبی تخلیق پر نادم بھی ہیں ؟"

مسکراہٹ قہقہے میں منتقل ہو گئی اور بیدی نے کھلکھلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر نادم نہ ہوتا تو اور افسانے کیوں کر لکھتا" اس کے بعد سنجیدہ ہوتے ہوتے بولے "مثلاً محبت نام ہے جسمانی اور روحانی اتصال کا۔ اتصال اپنے کمپوزٹ کردار کی وجہ سے دوامی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کا نتیجہ خجالت ہوتا ہے۔ کسی چیز کا تکمیل کو پہنچ جانا اپنے اندر کمال کا خط بھی رکھتا ہے اور خجالت بھی۔ کیونکہ آدمی ہمیشہ جد و جہد کرنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے۔"

"بے شک ــــ بے شک!" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ "اچھا یہ بتائیے کہ ادب ادیب کی شخصیت کا یا شخصیت سے اُس کے فرار کا ترجمان ہوتا ہے؟"

"فرار کا لفظ نامناسب ہے۔" بیدی نے رُک رُک کر کہا۔ "ادیب ادب میں اپنی شخصیت کو REPRODUCE کرتا ہے۔ کیا ایک ماں اپنے بچّے کو جنم دے کر اپنے آپ سے فرار کرتی ہے؟"

"ہرگز نہیں" غیر ارادی طور پر میں نے زیرِ لب کہا اور پھر بیدی صاحب کے پُر سکون اور پُر وقار چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں اُردو کا نیا افسانہ نگار نااُمیدی، بدگمانی، بے یقینی اور گم شدگی کا شکار کیوں ہے؟"

بیدی چند منٹ تک سوچنے کے بعد کہنے لگے۔ "وہ اس لئے کہ آج معاشرے کی کسی قدر پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔ والدین کے احترام سے لے کر تجرّد کی زندگی تک

پہلے زمانے کی قدریں آج کے آدمی کے لئے بے کار ہیں۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آج کا بیٹا والدین کا ادب نہیں کرتا؟"

بیدی صاحب نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا "نہیں یہ بات نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آج کا بیٹا اپنی پیدائش کو ایک حادثے کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ جب وہ اپنے سامنے یہ دیکھتا ہے کہ میرا باپ میری ماں سے نہ صرف بدسلوکی کرتا ہے بلکہ اُسے وہ تحفظ دینے کا بھی اہل نہیں جو میری ماں کو ملنا چاہیئے تو وہ اپنے باپ کی عزت کرنے کے باوجود باطنی طور پر اس سے کٹا کٹا سا رہتا ہے۔ وہ احتجاج کرتا ہے جو ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ حال ہی میں اپنے ایک افسانے میں ایسے ہی ایک باپ اور بیٹے کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کو میں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔"

"کیا نام ہے اُس افسانے کا؟" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"صرف ایک سگریٹ" اور بیدی نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

"آخر ایسا کون سا بیٹا ہے۔ جس نے زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر اپنے باپ کی جگہ لینی نہ چاہی ہو اور یہ ہے بھی درست کیونکہ زندگی کو آگے بڑھنا ہی چاہیئے۔ آج کا ادب اس تجربے کو بھی جس کا ہمارے سماج میں پرچار کیا گیا ہے ایک بے کار سی چیز سمجھتا ہے اور ایسا سمجھنے کی تائید میں اس کے پاس سائینٹفک دلائل بھی موجود ہیں سب پرانی اقدار ٹوٹ رہی ہیں اور نئی اُس کے ذہن میں ابھی وضع نہیں ہو پائیں

اور وہ اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ اگر وہ بھی جے کرشنا مورتی کی طرح یہ سمجھ لے کہ زندگی کے مسائل کا فتح ہونا ممکن نہیں اور صرف انہیں سمجھ لینا ہی اُن کا حل ہے، جب بھی اُس کی کشتی کنارے لگے اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اِس کُلیے کا بھی قائل نہ ہو اور اس مقدس بے اطمینانی کو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔ دیکھئے نا میرے نزدیک تو زندگی کے مسائل کا حل سادگی میں ہے لیکن وہ شخص جو دواؤں اور ڈاکٹروں پہ کثیر رقم خرچ کرنے کا عادی ہے اُسے اگر میں کہہ دوں کہ صبح اُٹھ کر گاجر کا مربّہ کھا لینے سے تمہاری سب تکلیفیں دُور ہو سکتی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ میری بات نہ مانے گا۔" اور اتنا کہتے کہتے بیدی کے چہرے پر پھر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے؟"

بیدی ایک دم متین ہو گئے اور کہنے لگے "جمود کا سوال بھی فن برائے فن قسم کا سوال ہے اگر کوئی ادیب چند مہینوں یا برسوں تک کچھ نہیں لکھتا جب بھی اُسے جمود پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جب وہ لکھے گا تو بھرپُور لکھے گا۔ اُس کی حیثیت اُس زمین کی طرح ہے جو کچھ وقت کے لئے بے کاشت پڑی رہتی ہے بلکہ کسان لوگ زمین کو بہتر بنانے کے لئے ایک بار یا اُس سے زیادہ بار زیادہ فصل اُگانے کے لئے اُسے بے کاشت رکھتے ہیں۔"

بیدی صاحب بول رہے تھے اور میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اُردو کے ایک عظیم افسانہ نگار سے نہیں پنجاب کے کسی کسان سے ہم کلام ہوں، لیکن تصوّر کا یہ جادو

دوسرے ہی لمحے ٹوٹ گیا کیونکہ بیدی صاحب اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کہہ رہے تھے "ادیب کی علیحدگی میرے نزدیک کوئی GRONY TOWER نہیں۔ ایک ادیب اگر اپنے آپ کو بمبئی کی تیز رفتار زندگی سے الگ تھلگ کر کے کسی پہاڑ پر جا بیٹھتا ہے تو وہاں بھی زندگی سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر وہ فارم کا گہرا احساس رکھتا ہے جب بھی زندگی ہی کی باتیں کرتا ہے۔"

"بڑے رجائیت پرست ہیں بیدی صاحب"، میں نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ لیکن زبان سے صرف اتنا کہہ سکا "آپ کے نزدیک ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟"

"بادی النظر میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے لیکن ——" میرا اندازہ صحیح ثابت ہو رہا تھا اور بیدی صاحب پر اعتماد لہجے میں کہہ رہے تھے "اگر ادیب اچھا اور صحت مند ادب تخلیق کریں تو یہ زبان جواب دب گئی ہے پھر کھل کر سامنے آجائے گی۔ اردو زبان اپنی اندرونی صحت اور قوت کی وجہ سے کبھی ختم نہ ہوگی ہمارا سیاسی نظام اور کچھ لوگوں کا تعصب کچھ مدت کے لئے اسے کچل سکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ آپ دیکھیں گے، فلموں کی زبان جسے پورے ہندوستان کے لوگ سمجھتے ہیں اردو ہے اور پھر پاکستان میں اردو کا بولا اور سمجھا جانا ہندوستان میں اس زبان کی بقا کا ضامن ہے۔"

"اور دیوناگری رسم الخط کو اپنا لینے کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں تو یہ کہتا ہوں ——" بیدی نے اسی پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا " کہ دیوناگری رسم الخط کچھ لوگ استعمال کریں گے لیکن محض خانہ پری کے لئے۔ یہ زبان اسی صورت اور اسی رسم الخط میں زندہ رہے گی کچھ لوگ ڈرتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں اُردو نصابوں سے خارج کی جا رہی ہے۔ اس لئے نئی پود اس سے بے بہرہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر کے لئے اس زبان کو گھن لگ جائے لیکن ہمیشہ کے لئے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

" آپ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے کس حد تک قائل ہیں بیدی صاحب؟"

" کس حد تک؟" بیدی نے آہستہ سے کہا اور پھر بلند آواز سے بولے " اس حد تک جس حد تک آپ دوسروں کو مبلغ محسوس نہ ہوں بلکہ ایک نامحسوس طریقے سے آپ کی تحریر لوگوں پر اثر انداز ہو۔ آپ ایک مؤدب انسان کی طرح اُن کی ذہنی تعلیم کے ضامن ہوں اور اس سے آپ کو بھی ایک رُوحانی سکون حاصل ہو اور آپ کہہ سکیں ؏

اپنا لہو بھی سُرخی شام و سحر میں ہے"

جواب سنتے ہی مجھے یہ سوال سوجھا " اور آپ ترقی پسند تحریک سے کس حد تک متاثر ہیں۔؟"

" میں اُس تحریک سے بہت متاثر ہوں اور مجھے اُس تحریک نے بے حد فائدہ پہنچایا ہے۔ میرے شعور میں شائستگی پیدا کرنے کی ذمہ دار بلاشُبہ ترقی پسند تحریک ہے لیکن ——" بیدی کہتے کہتے رُک گئے۔

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ —"، میں نے محسوس کیا کہ بیدی کے پُر سکون چہرے پہ ہلکی سی برہمی کی پرچھائیں لہرا رہی ہے — کہ میرے نزدیک ترقی پسندی کا مفہوم وہ نہیں جو میرے چند دوستوں کا ہے۔ میں کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ وہ میرے لئے قانون وضع کرے یا کسی طرح سے میری حد بندی کرے۔ یہ مجھے خود فیصلہ کرنا ہے۔ کہ انسانی فلاح کے لئے کون سی تنظیم بہتر ہے۔ میں فکر اور جذبے کے سلسلے میں خیال کو کوئی واضح شکل نہیں دیتا۔ میرے نزدیک فکر اور جذبے کو کوئی اقلیدسی شکل نہیں ہے، مثلاً محبت نہ مثلث ہے، نہ مخمّس اور نہ مسدس"

"اچھا جناب بیدی صاحب! اب چند ہلکے پھلکے سوالات دریافت کرتا ہوں جن میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ مختصر افسانے کی آپ کے نزدیک مختصر ترین تعریف کیا ہے؟"

"وہ مختصر ہو۔"

"سبحان اللہ! آپ نے تو میرے سوال سے بھی زیادہ ہلکا پھلکا جواب دیا ہے۔ خیر یہ فرمائیے کہ آپ افسانہ لکھتے کیوں ہیں؟"

"کیونکہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اور آپ افسانہ لکھتے کیونکر ہیں؟"

"کبھی لیٹ کر اور کبھی کرسی پہ بیٹھ کر۔"

"افسانہ لکھنے کے لئے آپ کو کیسا ماحول درکار ہوتا ہے؟"

" میز پر کتابیں بکھری ہوئی ہوں اور افسانے کے لئے ایک رم کاغذ اور ردی کی ٹوکری!"

" اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں کون کون سے حضرات آپ کو پسند ہیں؟"

" منٹو۔ عصمت۔ کرشن۔ قرۃ العین حیدر۔ اوپندر ناتھ اشک اور پھر بعد میں لکھنے والوں میں رام لعل اور جوگندر پال۔"

" منٹو اور کرشن میں آپ بہتر افسانہ نگار کسے سمجھتے ہیں؟"

" منٹو کو۔"

" کیوں؟"

" منٹو افسانے کو فنی اعتبار سے زیادہ سمجھتا ہے۔ کرشن کا صرف انداز تحریر زیادہ لبھاتا ہے۔"

" آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟"

" سولہ سال کی عمر میں جب میں ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔"

" آپ کی سب سے پہلی ادبی تخلیق کیا تھی؟"

" ایک انگریزی نظم 'باغِ ارم'، جو کالج کے میگزین میں چھپی تھی۔"

" اپنی سب سے پہلی کہانی آپ نے کون سی لکھی اور وہ کہاں شائع ہوئی؟"

" پہلی کہانی پنجابی میں لکھی تھی جس کا نام تھا 'دکھ سکھ'، اور یہ فارسی رسم الخط میں

چھپنے والے رسالے "سارنگ" میں شائع ہوئی تھی۔"

"اردو میں سب سے پہلی کہانی کب اور کون سی لکھی اور وہ کہاں شائع ہوئی؟"

"۱۹۳۶ء میں 'مہارانی کا تحفہ'، جو 'ادبی دنیا' کے سالنامے میں شائع ہوئی اور جسے اُس سال کی بہترین کہانی کا انعام بھی دیا گیا۔"

اس سے پہلے کہ آٹومیٹک مشین کی طرح میں اگلا سوال زبان پہ لاؤں، بیدی مسکراتے ہوئے کہنے لگے "لیکن اُس کہانی کو میں نے اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ یعنی میرے حواس شروع ہی سے قائم تھے اور مجھ میں ناقدوں میں سمجھ کا یہ پھیر جبھی سے قائم ہے۔ جو تخلیق اُن کی نظر میں اچھی ہے، ضروری نہیں کہ میں بھی اُسے اچھی سمجھوں اور اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔"

"بہت خوب! اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ کہاں اور کب پیدا ہوئے؟"

"لاہور میں یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو۔"

"تعلیم کہاں تک حاصل کی؟"

"انٹرمیڈیٹ تک۔"

"کوئی ایسا واقعہ بتائیے جس نے آپ کی ادبی زندگی پہ بہت زیادہ اثر ڈالا ہو۔"

بیدی نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "بے شمار واقعات نے چھوٹے چھوٹے اثرات چھوڑے ہیں۔" اور ایک دم پھر اُن کی آنکھوں میں ایک

چمک سی لہرائی اور وہ کہنے لگے "مثلاً جب میں نے جوانی کی سرحد میں قدم رکھا تو دوستوں کی محفل میں ایک دوست نے یہ کہتے ہوئے میری کھلّی اُڑائی کہ میں شکل وصورت، قد وقامت ذہنی صلاحیت کسی اعتبار سے بھی تو قابلِ قبول نہیں ہوں۔ اس واقعے سے میرے اندر شدید قسم کا ڈر پیدا ہو گیا اور مجھے یہ احساس بڑی طرح ستانے لگا کہ میں کچھ بھی تو نہیں۔ اس لئے کچھ بننے کے لئے میں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں۔ گانا سیکھنا شروع کیا اور گانے کا کہ تمغے تک حاصل کئے۔ لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا۔ میری جگہ گویّوں میں نہیں ہے۔ اُس کے بعد گھر میں کیمسٹری کی لیبارٹری بنائی اور کسی نئی ایجاد کی کوشش کرنے لگا۔ میں کیا ایجاد کرنے والا تھا؟ یہ مجھے خود بھی معلوم نہ تھا۔ آخر جب ایک دن تیزاب سے کپڑے جل گئے تو ایجاد کا یہ بھوت سر سے اُترا۔ پھر کچھ دنوں تک فارسی، پنجابی اور انگریزی میں شعر کہے اور آخر میں کہانی کو اپنا ملجا وماویٰ بنا لیا!"

"یہ کہانی کی خوش نصیبی ہے!" میں نے یہ بات اگرچہ سنجیدگی سے کہی لیکن بیدی نے اِسے ہنسی میں اُڑا دیا۔

"کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟" یہ سوال میں نے بیدی صاحب اکثر ادیبوں سے کیا ہے۔ لیکن آپ تو اس کلیے کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ اس لئے آپ سے یہ پوچھنا بے محل ہوتا ہے کیوں عیاں راچہ بیاں!"

بیدی نے شرماتے ہوئے بہت انکسار سے کہا "بے شک اچھا انسان ہوئے بغیر

اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ادیب کی ہر تخلیق اُس کی شخصیت سے چھن کے آتی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی صرف دو ہی نہیں دس بیس شخصیتوں میں جی سکے اور لکھنے کے عمل میں صرف ایک شخصیت کو بروئے کار لائے۔"

"بس بیدی صاحب میرے سوالات ختم ہوئے۔"

"تو آیئے کافی کا ایک اور دَور ہو جائے!" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بیدی نے کافی کا آرڈر دے دیا۔

آئینے کے سامنے

مجھے آج تک پتہ نہ چلا، کہ میں کیا ہوں؟

اس سے کوئی یہ مطلب نکالے کہ میں عاجزی دکھا رہا ہوں، تو یہ غلط ہوگا۔

بہت ممکن ہے کہ جو آدمی کسی دوسرے کے آگے نہیں جھکتا، یا کسی خاص نظریے کے حامیوں یا دھرم یا درس کی پیروی نہیں کرتا، وہ شائستگی کا پتلا ہو اور وہ شخص جو بہت ہاتھ جوڑتا ہے۔ جُھک جُھک کر بات کرتا ہے، غرور کا گھناؤنا نمونہ ہو۔

بلکہ عاجزی کا دکھاوا کرنے والا شاید زیادہ خطرناک انسان ہوتا ہے ——

" اپرادھی دونا نوے، جیوں ہنتا مرگا نیہہ"۔ —— (گرو گرنتھ صاحب)

(ظالم دوگنا جھکتا ہے، جیسے ہرنوں کو مارنے والا شکاری)

میں جانتا ہوں میں بالکل عام اور سادے شائستہ مزاج کا آدمی ہوں، لیکن مجھ

پر ایسے بھی لمحے آتے ہیں کہ اوپر اوپر سے دیکھنے والا انہیں میری اکڑفوں کہہ سکتا ہے وہ لمحے اس وقت آتے ہیں جب میں کوئی ادبی چیز لکھنے کے لئے بیٹھوں، مضمون میرے دل میں ہو، بات نئی اور نرالی ہو اور مجھے اسے پیرایۂ اظہار بخشنے کے لئے ایک باطنی قوت حاصل اور مکمل فہم ہو۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اپنے سے الگ کر کے دیکھ رہا ہوں —— ہٹ جاؤ میں آرہا ہوں —— باادب باملاحظہ ہوشیار . . . . یا . . . . سادھان راج راجیشور، چکرورتی سمراٹھ شری راجندر سنگھ بیدی رنگ بھومی میں بدھارتے ہیں!!!

کیونکہ ایسے ادراک کے بنا لکھنا آسان نہیں، اس لئے میری یہ لمحاتی اکڑفوں برتری سے علیحدگی کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت میرے اور کاغذ کے درمیان اور کوئی نہیں ہوتا، اس لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنے گھر بیٹھ کر ایک آدمی اپنے آپ کو کالیداس یا شیکسپیئر سمجھے، اس سے کسی کا کیا جاتا ہے؟ ہاں، لکھ لینے اور پبلشر کے پاس پہنچنے تک بھی وہ اپنے آپ کو مہان سمجھتا رہے، تو وہ بڑا احمق آدمی ہے۔ اوّل تو کاغذ پہ اترتے ہی اپنی اوقات کا پتہ چل جاتا ہے اور جو نہ چلے، تو دوست بتا دیتے ہیں اور زیادہ بے عزتی کرنا چاہیں، تو بتاتے بھی نہیں۔

ہاں، تو میں کون ہوں؟

عام طور پہ یہی پوچھا جاتا ہے کہ خاص آدمی کون ہے؟ یا کیا ہے؟ ۔ مطلب یہ کہ کیا کام کرتا ہے؟ میرے بارے میں یہ دونوں سوال فالتو ہیں۔ کیونکہ چند لوگ

مجھے جانتے ہیں یکیا کام کرتا ہوں ؟اس سے بھی واقف ہیں۔ بھلا ہو فلموں کا جنہوں نے مجھے بدنام کردیا۔ یہ دنیا عقل مندوں کی دنیا ہے۔ شہرت یافتہ شخص کی طرف لوگ آنکھیں پھیلا کر دیکھتے ہیں، لیکن ایسے آدمی کو اپنے جانے پہچانے ہونے کی جو قیمت دینی پڑتی ہے اُس سے لوگ بالکل واقف نہیں اور اسی لئے وہ شہرت کی خواہش کیا کرتے ہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ ہماری فلموں کے ہیرو لوگوں سے پوچھیئے۔ کیا وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی پُرسکون انداز سے بسر کرتے ہیں ؟ وہ تو گھر میں بھی ہوں تو بیوی کے لئے ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں، جو ان کی رگ رگ پہچانتی ہے اور مسکراتے ہوئے کہتی ہے:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز ے قدت را می شناسم

اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کتا یاد آجاتا ہے (میں پھر عاجزی کا دکھاوا نہیں کر رہا) جسے ایک ڈائریکٹر نے اپنی فلم میں لیا تھا۔

کتا فلم کے تسلسل میں آگیا یعنی سین نمبر بارہ میں آیا، تو سین اکیاون میں بھی اس کی ضرورت تھی اور وہ سین چھ مہینے بعد لایا جانا تھا۔ بے چارہ، اچھا بھلا کتا تھا۔ بازار میں گھومتا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر یا ادھر اُدھر ہر جگہ کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں سر دُھنتا تھا، لیکن فلم میں آجانے کے بعد وہ ایک بالکل تجارتی چیز —— ایک جنس بن گیا، جو کہ بک سکتی تھی، جس کا بھاؤ تاؤ ہو سکتا تھا۔ اس لیے ڈائریکٹر صاحب

نے اسے باندھ کر رکھ لیا، اب بے چارے کو دن میں تین چار وقت کھانا ملتا تھا۔ سونے کے لئے گدے ملتے تھے، زکام ہونے پر بھی ڈاکٹر کو بلایا جاتا تھا۔ وہ ہر آدمی کو فرشتہ سمجھنے لگا یعنی کہ جتنا کُتا، شیطان اور فرشتے میں امتیاز کر سکتا ہے چنانچہ فلم بنتی رہی اور کُتے صاحب موج اڑاتے رہے۔ اُدھر فلم ختم ہوئی، ادھر انہیں چھوڑ دیا گیا — دوسرے لفظوں میں آزاد کر دیا گیا۔ لیکن اب کوڑے کے ڈھیر سے روزی کریدنے کی ان کی عادت نہ رہی تھی۔ وہ بار بار گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتے اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے دُم ہلاتے، جس کے جواب میں انہیں ٹھوکر ملتی اور "چوں — چوں،" کرتے ہوئے وہ وہاں سے بھاگ جاتے، لیکن پھر گھوم پھر کر وہیں...... وہی حیرانی، وہی اپنی اوقات کا پتا، وہی گالی — یہ ڈائرکٹر کتا نہیں، کوئی انسان ہے!

یہ اُس آدمی کی حالت ہے، جو شہرت میں بہک جائے یا زندگی میں کسی عہدے کا، کرسی کا بھوکا ہو، پیسے چاہتا ہو، جس سے وہ چیز کو خریدنے کی طاقت حاصل کر سکے۔ قانون، قیادت، دھرم، حکومت سب کو جیب میں ڈال لے۔ لو لینا کے ہیرو کی طرح کسی روحانی اُلجھن کا شکار ہو جاتے، مزے اُڑائیے اور لوگ داد دیں: "بڑے لوگوں کے چو چلے ہیں!" "شہرت، کرسی، پیسہ ایسی خطرناک چیزیں ہیں۔ کہ انہیں حاصل کرنے کے بعد ہر شریف آدمی ان کا تیاگ کرنا چاہتا ہے، لیکن جیسا کہ کسی نے کہا ہے "میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں۔ مجھے کمبل نہیں چھوڑتا"۔ یہ چیزیں اس

کا پیچھا نہیں چھوڑتیں مگر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ وہ شخص خالی باتیں ہی باتیں کرتا ہے یا واقعی ان چیزوں کو چھوڑنا چاہتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، میرے ایک چاہنے والے، میرے معترف، مجھے مل گئے انہوں نے میری کچھ کہانیاں پڑھی بھی تھیں۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے، جو زندگی کا بھید جانتے ہیں۔ تھوڑا اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ سیدھے مطلب پر آ گئے :-

"بیدی صاحب، آپ بہت بڑے آدمی ہیں !"

"جی؟" میں نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔ "میں جی (پنجابی میں)۔۔۔ جی میں تو کچھ بھی نہیں !"

اور جب انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔

میں کون ہوں ؟ کیا ہوں ؟ کے سوال تو ختم ہوئے۔ دراصل یہ سوال مجھ پر لاگو ہی نہیں ہوتے۔ میں تو ان لوگوں میں ہوں، جن سے پوچھنا چاہیئے، آپ کیوں ہیں ؟ — یعنی کہ آخر — کیوں !

یہ بھی میں نہیں جانتا۔

واقعی دنیا میں کروڑوں انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہی کی طرح میں بھی ایک دن اچانک پیدا ہو گیا۔ ماں کو خوشی ہوئی ہو گی، باپو کو خوشی ہوئی ہو گی۔ مگر دائیں ہاتھ کے پڑوسی کو پتا بھی نہ تھا اور پڑوسی کو پتا ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ وہ ضرور اچھے تعلقات کے پیشِ نظر مبارک باد دینے آیا ہو گا میرے پیدا ہو جانے

سے اُسے کیا خوشی ہو سکتی تھی؟ اُلٹے اس لین دین کی دُنیا میں اُس کے لڑکے پنالال کا مخالف پیدا ہو گیا — یعنی کہ پکا حریف۔ اس کی پیدا ہونے والی لڑکی کے لئے خواہ مخواہ کا خطرہ ۔ ۔ ۔ تو گویا ایک قاعدہ بنا ہوا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی پیدا ہوں، تو مبارک باد دو۔ چوڑھ سنگھ ہوں تو بدھائی دیں، ڈھیلو رام یا چھینے خاں آ جائیں، تو خوشی مناؤ، ڈھول بجاؤ!

ٹیگور کہتے ہیں: دنیا بھر میں ہر روز جو نئے انسان پیدا ہو جاتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بھگوان انسان بنانے سے ابھی تھکا نہیں۔ بھگوان بھی ہنسی مذاق کی اوٹ میں کتنا ظلم کرتا ہے! چونکہ وہ تھک نہیں سکتا، اس لئے انسان بناتا جا رہا ہے۔

بے کار مباش کچھ کیا کر!

پاجامہ ہی ادھیڑ کر سیا کر!

چنانچہ خدا کے پاجامے کا آخری ٹانکا یعنی کہ میں ستمبر ۱۹۱۵ء کی صبح لاہور میں تین بج کر بیتالیس منٹ پر صرف مہاکوی ٹیگور کے دعوے کی تائید کے لئے پیدا ہو گیا... رام اور رحیم انسان کی طرح بھول گئے کہ دنیا دُکھ کا گھر ہے، ورنہ اس دنیا میں مجھے بھیجنا ان کی رحمت کی بات تھی؟ بلکہ ہمارے شاستروں کے مطابق تو یہ ان کا کوئی بدلہ لینے کا ڈھنگ تھا۔ کوئی کرم، جو پچھلے جنم میں کئے ہوں گے، خدا کی رحمت بھی دھو سکنے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔

ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے، میرے ماں باپ کی بھی یہی خواہش تھی۔ ان بے چاروں کا کیا قصور؟ ان کی قوتِ فکر کلکٹر تک ہی تھی۔ انہیں کیا معلوم، کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کلکٹر بھی اس کے سامنے پانی بھریں۔ جیسے سیدھا سادا ایک جاٹ مالگزاری کے سلسلے میں تحصیلدار کے سامنے پیش ہوا، تو تحصیلدار صاحب نے جاٹ کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ جاٹ نے بہت خوش ہو کر دعا دی۔

"بھگوان کرے، تحصیلدار صاحب، آپ ایک دن پٹواری بنیں۔۔۔"

مقابلے کی اس دنیا میں لوگ بڑے بڑے حوالے دے کر بات کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ ہر عام آدمی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں رلنکن، لاگ کیبن، (لکڑی کی جھونپڑی) میں پیدا ہوا اور یونائیٹڈ اسٹیٹس (ریاستہائے متحدہ امریکہ) کا پریذیڈنٹ بنا۔ لاگ کیبن سے پریذیڈنٹ کی کہاوت چل پڑی۔ لیکن اس کو بیان کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ کتنے ایسے لوگ ہیں، جو جھونپڑی سے نکل کر شاہی ایوان تک پہنچتے ہیں؟ اس دھوکے، اس سازش کے شکار ہو کر لاکھوں کروڑوں سر پٹکتے مر جاتے ہیں اور پھر

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر!

اس کے بعد بھی آپ اس کی خدائی سے ناانصافی کرنا چاہیں تو آپ کی مرضی!

بس ایک بیمار بچہ تھا —— ایک بیمار ماں کا بیٹا۔ میں نے میعادی بخار کے

وہ بچکولے دیکھے ہیں، جن کا محور مریض ہوتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے زندگی کے گوپھیا میں ڈال کر اُسے بار بار دور کسی موت کی دھرتی سے پرے پھینکا جا رہا ہے۔ میں نے تکیے میں آنکھیں دبا کر، ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوتے وہ ہزاروں رنگ دیکھے ہیں، جو کسی عکس کی پکڑ میں نہیں آتے اور رنگوں کا امتیاز کرنے والا طریقہ بھی جن کا امتیاز کرنے میں قاصر ہے اور قوسِ قزح جن کی حد باندھنے سے مجبور، وہ آنسو روئے، جو نہ نمکین تھے، نہ میٹھے، جو کسی ذائقے کی پکڑ میں نہیں آتے اور جنہیں پیار کرنے والے ماں باپ، بھائی بہن یا محبت نہیں پوچھ سکتی۔ سینکڑوں بار کسی بھیانک اجاڑ میں اکیلا رہ گیا ہوں اچانک ڈر کر پوری شدت کے ساتھ مجھے محسوس ہوا کہ کروڑوں میلوں تک میرے پاس کوئی نہیں، میں بھی نہیں ....

بیسیوں بار میں نے انگلستان کا وہ بازار دیکھا ہے یا بنارس کا گھاٹ جہاں پچھلے جنم میں پیدا ہوا تھا... گنگا باڑھ کے بعد ہٹ گئی ہے اور کناروں کے قریب سرخی اور زردی سے ملی جُلی مٹی کے بیچ ہزاروں لاکھوں چھوٹی چھوٹی دھاریں چھوڑ گئی ہے جہاں پیر پڑتا ہے تو ایک دھار یہ نکلتی ہے.... اور وہاں آٹھ نو برس کا ایک کالا کلوٹا بچہ ننگا، کمر میں سیاہ دھاگا باندھے، سر پہ چوٹی لئے کھڑا ہے اور وہ میں ہوں......

اس سے پہلے کہ میں بڑا ہو کر اپنی نسوں کو بدکاری اور کاروباری فضولیات میں برباد کر لیتا، میرے جسم کے رگ پٹھے ختم ہو چکے تھے۔ ذرا سی بات پہ بلاض

ذراسی بات پر ریں ریں، اُوں اُوں ۔ ۔ ۔ ۔ ماں جھلا کر مجھے دُور پھینک دیتی تھی، کیونکہ میں اُس کی بیمار چھاتی تک چھوڑ ڈالتا تھا۔ ماں، تم ہو نہ ہو، مجھے میرا دودھ دے دو۔ میں آج تک پکار رہا ہوں ـــ ماں، مجھے میرا دودھ دے دو اور اماں کہیں نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں، تو ایک بار پھینک دینے کے بعد اتھاہ ممتا کے جوش میں ماں مجھے پھر اٹھا لیتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، مجھے رکھے یا پھینک دے ۔ ۔ ۔ ۔

میں کتنی بار مرا اور کتنی بار زندہ ہوا۔ ہر چیز کو دیکھ کر حیران، ہر مشکل کے بعد پریشان میری حیرانی کی کوئی حد نہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا لگا، میری جنم کنڈلی دکھائی گئی۔ جیوتشی نے کہا۔ لگن میں کیتو ہے۔ دہستی اپنے گھر کا ہے اور عطارد پر زور ڈالتا ہے۔ یہ بالک کوئی بہت بڑا کلاکار بنے گا۔ لیکن چونکہ زحل کا دباؤ بھی ہے اس لئے اسے نام مرنے کے بعد ملے گا ۔ ۔ ۔ ۔ سورج بھاری ہے، دھن اور لابھ ستھان میں پڑا ہے اور اُسی گھر میں زحل ہے، جسے سورج نے اپنے تیج سے ماند کر دیا ہے چونکہ زحل عطارد پر بھاری ہے اس لئے اس کی زندگی میں بیسیوں عورتیں آئیں گی۔ زحل اور عطارد کا یہ میل شاید اسے "کوٹھے" پر بھی لے جائے، لیکن دہستی گھر کا ہونے کی وجہ سے کبھی بدنامی نہیں ہو گی ـــ بیچئے!

۔ ۔ ۔ پھر منگل بھی سنیچر کے ساتھ پڑا ہے۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں لیکن پھر بھی منگل منگل ہے، اثر تو کرے گا ہی۔ کام چلتے چلتے ایک دم رُک جائیں گے، خاص طور پر ان دنوں جب کہ دہستی دتر ک ہو گا۔ دسویں گھر میں راہو بیٹھے

جسے منگل دیکھتا ہے، اس لئے پتنی ہمیشہ بیمار رہے گی۔ گویا میرے باپ کی بیوی بیمار، سدا کی روگی اور میری بیوی بھی......

چنانچہ آج تک میں نے ایک بیوی کی زندگی تباہ کرنے اور چند بچوں کا مستقبل خراب کرنے کے علاوہ کوئی زرخیز کام کیا ہے، تو یہ ورق کالے کرنا، کچھ کتابیں لکھ ڈالنا اور پھر خود ہی ان کو خریدنے کے لئے چل دینا، کچھ فلمیں فیل کرنا

چند تصویر بتاں حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

میری ماں برہمن تھی اور میرے پتا کھشتری۔ اس زمانے میں اس قسم کی شادی گریٹنا گرین (ایک جگہ جہاں جا کر بھاگے ہوئے جوڑے شادی کرتے ہیں) میں بھی نہ ہو سکتی تھی، لیکن ہو گئی، میرے ماں باپ ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔ اس لئے گھر میں ایک طرف گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف ستوتر اور گیتا کا پاٹھ ہوتا تھا۔

پہلی کہانیاں جو بچپن میں سنیں، جن اور پریوں کی داستانیں نہ تھیں، بلکہ مہاتم تھے، جو گیتا کے ہر ادھیائے کے بعد ہوتے ہیں اور جو بڑے یقین کے ساتھ ہم ماں کے پاس بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چند باتیں تو سمجھ میں آجاتی تھیں، جیسے، راجا، براہمن بھوت، لیکن ایک بات ——

"ہاں یہ دگینگا، کیا ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے، آرام سے بیٹھو!"

"اُونہوں، بتاؤ نا — گینکا.....؟"

"چپ!"

اور پھر وہ رحم، جو ماں کو ہی آسکتا ہے، جب وُہ اپنے بچے کے چہرے کو یکایک کملاتے ہوئے دیکھتی ہے —

"گینکا بری عورت کو کہتے ہیں۔"

"تم تو اچھی عورت ہو نا، ماں؟"

"ماں ہمیشہ اچھی ہوتی ہے؟"

"تو تو سر کھا گیا ہے، راجے.... ا بری عورت ہوتی ہے، جو بہت سے مردوں کے ساتھ رہے۔"

بس سمجھ گیا لیکن دوسرے دن مجھے وہ جوتے پڑے کہ بس ہُوا یہ کہ میں نے دوسرے دن پڑوس میں ساوتری کی ماں کو گینکا کہہ دیا کیونکہ اس کے گھر میں دیور، جیٹھ اور دوسرے انٹ شنٹ قسم کے بہت سے مرد رہتے تھے۔

چنانچہ میری باقی کی زندگی بس ایسی ہی ہے۔ ادھر میں نے سوال کیا، ادھر زندگی نے کہا "چُپ!" اور جو کہیں جواب بھی دیا، تو ایسے کہ اسے سمجھ ہی نہ سکوں۔

میری جسمانی کمزوری، نسوں کا الجھے ہونا، میرے سوالوں کا جواب مناسب طور

پر نہ دیا جانا یا میرا جواب کی ماہیت کو نہ سمجھنا ایسی باتیں ہیں، جو کسی بھی بچے میں گہری سوچ پیدا کر سکتی ہے اور وہ ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے، حساس ہو جاتا ہے۔ پھر زندگی میں سیدھے سادے اندھیرے کے علاوہ سب کچھ جاننے والا بھی ہے — تمام ہُو — بیسیوں ڈر ہیں، خطرے ہیں، مایوسیاں ہیں، جو دل میں ہر وقت کپکپی پیدا کیے رہتی ہیں۔ جیسے بجلی کا معمولی سا اشارہ ڈیری فارم میں جھرجھری پیدا کر دیتا ہے .... باقی کی چیزوں میں واقعات اور تحریکیں ہیں۔ جو ہر ادیب کی زندگی میں آتے ہیں۔ وہ ان سے سیکھتا ہے ان کا اثر قبول کرتا ہے اور پھر انہیں کاغذ پر اتارنے کی کوشش۔

یوں جاننے کو پانچ برس کی عمر میں رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور اُن کے پاتروں سے متعارف ہو چکا تھا۔ اب رامائن کتنی بڑی کتاب ہے، اس میں کتنے خوبصورت، صدگنی اور تیاگی پاتر آتے ہیں لیکن اس کی کیا وجہ کہ رامائن کے پاتروں میں مجھے سب سے زیادہ ہمدردی سُگریو کے ساتھ ہوتی، جس کا بڑا بھائی بالی اُس کی بیوی تک کو اُٹھا کر لے جاتا ہے اور وہ بے چارہ منہ اُٹھا کر دیکھتا رہ جاتا ہے اگر بھگوان رام ادھر نہ آ نکلتے تو سُگریو بے چارہ لنڈورا ہی رہ گیا تھا اسی طرح میری دلچسپی کا مرکز، ایک پاتر مہابھارت میں آتا ہے — شیکھنڈی، جس کے بیچ میں رکھ کر بھیشم پتامہ کو مارا جاتا ہے ورنہ وہ مرتے؟ آج تک زندہ ہوتے!

ماں کی بیماری کی وجہ سے میرے پتا بازار سے ایک پیسہ روز کے کرائے پر

کوئی نہ کوئی کتاب مانگے آیا کرتے اور میری ماں کے پاس بیٹھ کر اسے سنایا کرتے۔ میں پائنتی میں دبکا سنا کرتا۔ سکول کی عمر کے ساتھ ٹاڈ کے راجستھان اور شرلک ہومز کے کارناموں سے متعارف ہو چکا تھا۔ جو چیز اپنی سمجھ میں نہ آتی، وہ تھی، «مسٹری آف دی کورٹ آف پیرس!» مجھے صرف اتنا یاد ہے، تایا اُسے بڑے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے اور میں حیران ہوتا تھا کہ یہ خاص آدمی کیوں ہر بار کسی نئی عورت سے کوئی گڑ بڑ کرتا ہے۔ تب تک میں جان چکا تھا کہ عورتوں کے پیچھے پڑنا کوئی شرافت کی بات نہیں اور یہ کہ عورت بہت گندی چیز ہے..... چنانچہ میں ان منا ہو کر سو جاتا۔

اس کے بعد میرے چچا نے سٹیم پریس خرید لیا، جو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لایا۔ پرائمری سے مڈل تک پہنچتے پہنچتے میں نے وہ سب چٹ کر لیں۔ وہ روح پلا کیڑا تھا، جو ہر پرانی کتاب میں سے نکلتا ہے، یا ایک مارک، جسے ہر پبلشر نئی کتاب میں ڈال دیتا ہے۔ ان جانے میں قریب قریب ہر چیز سے متعارف ہو چکا تھا۔ لیکن عمر کے لحاظ سے نہیں۔ ناپختگی اور پختگی عمر میں فاصلہ ہونے سے جو بھی تباہی ہو سکتی ہے، ہوئی۔ میں ہر تجربے کی سُولی پر چڑھا اور شاید میرے لئے ضروری بھی تھا۔

زندگی کی ایسی بنیاد کو تفصیل سے بتا دینے کے بعد باقی کے واقعات کا ذکر کرنا لاحاصل ہے، یہی نا، میں نے میٹرک پاس کیا، کالج میں داخل ہوا۔ انگریزی

اور پنجابی میں شعر کہے۔ اردو میں افسانے لکھے۔ ماں چل بسیں۔ ڈاک خانے میں نوکر ہو گئے۔ شادی ہوئی۔ بچہ ہوا۔ پتا چل بسے۔ بچہ چل بسا۔ نو سال ڈاک خانے میں نوکری کی۔ ریڈیو میں چلے گئے ...... بٹوارہ ...... ظلم ... بربادی .... لہو سے لتھڑے ہوئے بدن ...... ریل کی چھت پر ننگے دلّی پہنچنا ...... سٹیشن ڈائریکٹر جموں ریڈیو سٹیشن .... ریاست کی، عوام کی حکومت، سے لڑائی .... پھر بمبئی ...... اچھی فلمیں، بری فلمیں ...... کہیں کہیں بیچ میں کہانیوں کی کسی کتاب پر۔ ہاتھ قلم کرتے رہے۔ ہاتھ قلم ہوتے سنے ہیں؟ دیکھے نہیں۔ مرزا غالب لکھتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر کوئی حادثہ یا ایسا لمحہ، جو کبھی خیال میں بھی نہ آئے۔ ایسے پل، جنہیں اجامل (ایک گنہگار برہمن) بھی نہ سہار سکا۔ بیوی میں دلچسپی سے اکتاہٹ، بیوی کی اپنے ساتھ محبت کا خاتمہ۔ وجہ؟ ادھیڑ عمر کا سڑی پن .... بڑے بیٹے کا مجھے کاروباری طور پر بے وقوف سمجھنا اور میرا صرف اسے پیسے کا پجاری اور غیر ذمے دار ا .... بھلا کوئی بات ہوئی؟

میری کوششیں — میری منّتیں کیا ہیں؟ .... کوئی نہیں۔ میری امیدیں کیا ہیں اور — مایوسیاں کیا؟ کوئی نہیں۔ میں عقل مندی کی وجہ سے کسی عورت سے محبت نہیں کرتا اور وہ بے وقوفی کی وجہ سے مجھ سے نہیں کرتی — اس لئے کہ میں

خوشبو اور محبت کا تال جانتا ہوں۔ بغیر خواہش کے میری ایک ہی خواہش ہے کہ میں لکھوں ـــــ پیسے کے لئے نہیں، کسی پبلشر کے نہیں، میں بس لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی دھرم گرنتھ کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان باسی کتابوں سے اچھی میں خود لکھ سکتا ہوں مجھے گرو ـــــ استاد اور کسی بھینٹ کی تلاش نہیں، کیونکہ ہر آدمی آپ ہی اپنا گرو ہو سکتا ہے اور آپ ہی اپنا چیلا ـــــ باقی دکانیں ہیں۔ میں نے ہرے ہرے پتوں اور چنبیلی کے پھولوں سے باتیں کی ہیں اور ان سے جواب لیا ہے۔ میں کوّوں کی زبان جانتا ہوں، میرا کتا مجھے سمجھتا ہے اور میں اسے۔ مجھے کسی عالمگیر سچائی کی ضرورت نہیں، کسی نجات کی ضرورت نہیں۔ اگر بھگوان انسان کو بنانے کی حماقت کرتا ہے۔ تو میں انسان ہو کر بھگوان بنانے رہنے کی بے وقوفی کیوں کروں؟ اگر اس عالمگیر سچائی کو میری ضرورت ہے، تو میں سمجھتا ہوں، وہ ماضی اور مستقبل کے درمیان، کسی بھی پرسکون لمحے میں مجھے اپنے آپ ڈھونڈے گا۔ میں ایک سادے سے انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں ـــــ چاہنے کی آرزو نکال کر۔ ایک ایسے مقام پر پہنچنے کی تمنا رکھتا ہوں جہاں تمنّا سے بے لاگ رہا جا سکے ـــــ جسے ہم سنتوں کی زبان میں رسہج اور ستھا، (عام حالت) کہتے ہیں اور جو صرف جاننے کے بعد آتی ہے،

اور ـــــ

میں نہیں جانتا!

چلتے پھرتے چہرے

اس وقت میں صرف ایک ہی چہرے کی بات کر رہا ہوں جو بہت "چلتا پھرتا ہے"
...اور وہ چہرہ آج کل کے عام نوجوانوں کا ہے... چنانچہ میرے بیٹے کا بھی۔
اپنے بیٹے کا چہرہ دکھانے کی کوشش میں اگر کہیں بیچ میں آپ کو میرا چہرہ بھی دکھائی دینے لگے تو بُرا مت مانیئے گا کیونکہ میں آخر اسی کا باپ ہوں، اپنے بیٹے پر ہی گیا ہوں۔ چنانچہ جو کچھ بھی آپ کو میرے بیٹے کے خلاف لکھا ہوا معلوم ہو گا وہ دراصل میرے اپنے ہی خلاف ہو گا۔ کیونکہ اسے اس دنیا میں لانے کے علاوہ اس کی جسمانی اور ذہنی تربیت کا ذمہ دار میں ہوں۔ البتہ جو اس کے حق میں کہوں گا وہ میرے بیٹے کی اپنی لیاقت ہو گی جس میں میرا رتی بھر بھی قصور نہیں۔

میرے بیٹے کا قد لمبا ہے اور رنگ کسی قدر کھلتا ہوا، حالانکہ میرا قد چھوٹا ہے اور رنگ بھی پکا۔ اس کی وجہ غالباً میری بیوی ہے جس کے میکے میں سب لوگ

لمبے قد کے ہیں اور رنگ کے گورے۔ میاں بیوی کے ملاپ سے جو نتیجہ نکلتا ہے۔ اس سے کھٹکا ہی لگا رہتا ہے۔ نامعلوم کیا چیز نکل آئے؟ مثلاً ایکٹرس ہیلن ٹیری نے جارج برنارڈ شاہ کو لکھا تھا "ہم دونوں کا ملاپ ہو جائے تو اولاد کتنی اچھی ہو" جس پر نارڈ شاہ نے جواب دیا تھا "مادام بدقسمتی سے اگر بچہ کو شکل میری مل گئی اور عقل آپ کی تو..... ؟ شا کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو ان کا یہ لطیفہ پتا ہوا معلوم ہو تو اندازہ کیجئے۔ اگر بچے کو شکل ہیلن کی اور عقل شا کی مل جاتی تو؟

میرا بیٹا بہت دبلا ہے مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ وہ کسی جیٹ ہوائی جہاز کے بہت ہی قریب نہ چلا جائے۔ یا کوئی میرے بیٹے کے بہت ہی قریب منہ کر کے پھونک نہ مار دے۔ اس کے مہین سے چہرے پر موٹی سی ناک رکھی ہے۔ جو اس بات کے انتظار میں رہتی ہے کہ چہرے کے باقی خدوخال بھی بھر جائیں۔ تاکہ وہ خود معقول معلوم ہو اور بات بات پر اسے لال نہ ہونا پڑے۔ اس وقت میرے بیٹے کی ناک کے نتھنے یونان سے ہندوستان تک بھاگ کر آئے ہوئے سکندر کے گھوڑے بوس فیلس کے نتھنوں کی طرح کھلتے بند ہوتے ہیں۔ یا اس وقت کام میں آتے ہیں جب انہیں اپنے مالک کی انا یاد ہم کو جتانا ہو، ورنہ وہ تو مہینے میں تین چار بار صرف زکام کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔

اس کے زکام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جوانی میں مجھے بھی اکثر زکام ہوا کرتا تھا۔ لیکن میں نے ورزش کر کے وقت پر سو کر اور وقت پر جاگ کر اسے ٹھیک کر لیا تھا۔

لیکن میرا بیٹا اس زکام کو بالکل انقلابی طریقہ سے ٹھیک کرتا ہے۔ وہ رات کے ایک ڈیڑھ بجے تک کامیکس، یا نیویارک کا ہفتہ وار انگریزی رسالہ "ٹائم" پڑھتا رہتا ہے۔ جس پر اس کا دنیا بھر کے علم کا مدار ہے اور پھر صبح سب سے آخر میں اٹھتا ہے جب کہ اس کے بہن بھائی اسکول وغیرہ جا چکے ہوتے ہیں۔ ماں گھر کا سب کام کر چکی ہوتی ہے اور میرا ایک پیر گھر کے اندر ہوتا ہے اور ایک باہر۔ تب وہ بلند کانا میرے پاس آتا ہے۔ اور مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ اسے دیکھتے ہی پہلے میں سلام کرتا ہوں۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر ایک بار میں نے اس کو سلام کے سلسلے میں انکار کر دی تو مجھے کبھی سلام نہیں کہے گا۔ اس کا تو کچھ نہیں جائے گا۔ میرا سارا دن کڑھتے رہنے کی وجہ سے برباد ہو جائے گا اور آپ جانتے ہیں کہ دنوں کے تسلسل ہی کو زندگی کہتے ہیں۔

میرے بیٹے کے ہونٹ پتلے ہیں اور ٹھوڑی مضبوط جو ایک پکے ارادے کا ثبوت ہے اور جسے وہ اکثر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر استعمال کرتا ہے۔ آنکھیں چھوٹی ہیں جن سے پاس کا تو سب کچھ دکھائی دیتا ہے اور دور کا اتنا بھی نہیں جتنا کوئی صحت مند آدمی مٹی کا ڈھیلا پھینک سکے۔ اس لئے میرا بیٹا آج کل کے نئے علم کا چشمہ پہنتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر کی بھویں گھنی ہیں جو خلوص کی نشانی ہوتی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ میرے بیٹے میں خلوص نہیں۔ اس میں خلوص ہے۔ بہت ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی آدمی سے دھوکا نہیں کھاتا اور یہ آج تک میری

سمجھ میں نہیں آیا کہ آدمی کا دل صاف ہو اور اس میں خلوص ہو پھر بھی وہ دھوکا نہ کھائے؟

میرے بیٹے کا ماتھا چھوٹا ہے۔ کہتے ہیں، ایسی تنگ پیشانی کے لوگ زیادہ بھاگیہ وان نہیں ہوتے جس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ راک فیلر کے گھر میں پیدا ہونے کے بجائے ہمارے گھر میں پیدا ہو گیا۔ لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کی ماں کام کر کے مری جا رہی ہے۔ میں مر مر کے کام کرتا جا رہا ہوں اور وہ مزے سے لیٹا ہوا ہے۔ تو مجھے بزرگوں کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔ وہ فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے اگر وہ کسی کی بات بیچ میں نہ کاٹے تو اپنے چہرے پر کے رگ و ریشوں کی خفیف سی جنبش سے دوسرے کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہے کہ آپ کی بات تو میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا اس پر بھی آپ کہتے رہنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے۔ اور یہ اس کی اسی ناطق خاموشی کی وجہ ہے کہ اسے اپنے باپ کو کبھی بے وقوف کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غالباً یہ اس کی بے صبری نہیں۔ آج کل کی تیز رفتار دنیا ہے جس سے میرا بیٹا مطابقت رکھتا ہے اور میں نہیں رکھتا۔ وہ کار بھی چلائے گا تو چالیس پچاس میل کی سپیڈ پر اور میں بیس پچیس پر ٹرک ٹوں رہوں گا۔ اس نے کئی ایک ایکسیڈنٹ بھی کئے جن میں سے دو تو بہت قیمتی تھے۔ ایک کوئی اٹھارہ سو روپے کا تھا اور دوسرا کوئی بارہ ساڑھے بارہ سو کا۔ اور اس پر بھی مجھے اس بات پر شرمندہ نہ کرے کہ میں اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک دن میں اور میرا بیٹا کار میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے۔ میں حسبِ معمول سلو اسپیڈ میں تھا۔ اچانک پیچھے سے کوئی بچہ بھاگ کر آیا اسے کار کا دھکا لگا تو وہ فٹ پاتھ پر جا گرا۔ خیر یہ ہوئی کہ اس کی جان بچ گئی اور ساتھ ہماری بھی۔ ہسپتال سے اسے مرہم پٹی کروانے کے بعد ہم گھر کے لئے روانہ ہوئے تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "دیکھا میں تمہاری اسپیڈ پر ہوتا تو بچہ مر گیا ہوتا تھا۔

"آپ میری اسپیڈ پر ہوتے" میرے بیٹے نے کہا "تو بچے کے آنے سے بہت پہلے نکل گئے ہوتے"

یہ شاید خلیل جبران نے کہا ہے کہ آپ اپنے بچے کو اپنا جسم اور ذہن دے سکتے ہیں۔ اپنے خیالات نہیں دے سکتے۔ ایک تو یہ کہ لکھنے والوں نے بڑی گڑبڑ کی ہے۔ وہ الفاظ میں حقیقت کا ایک لمحہ جکڑ لیتے ہیں۔ اس وقت آدمی یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کی ہر چیز ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے اور کوئی حقیقت مطلق نہیں حقیقت ایک مقامی حیثیت رکھتی ہے اور کاہل پسند، کند ذہن اس وقت، پڑھنا اور سوچنا بند کر دیتا ہے اور اس محدود حقیقت کو دُنیا بھر پر پھیلاتا رہتا ہے۔ کوئی خلیل جبران سے پوچھے "کیوں بھئی۔ ہم انہیں اپنے خیالات کیوں نہیں دے سکتے"

پھر کیوں ہمیں کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کو بچوں کے سامنے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ حالانکہ یہی فطری جھگڑا ہے جسے دیکھ کر بچے کو سمجھنا چاہیئے کہ زندگی صرف قلاقند ہی نہیں کونین کی گولی بھی ہے اور اس آدمی کا آپ کیا کریں گے جس نے

کبھی کبھی بچے کو ماں باپ کا ننگا بدن دکھلانے کی سفارش کی ہے۔ یہ خارجی زندگی ہے جو بچے کے خیالات کی رہنمائی کرتی ہے اور آخر اس کی "پریرنا" کا حصّہ ہو جاتی ہے۔ آج کل کے بچے کانوں اور آنکھوں کے ذریعہ سے ہزاروں آوازوں اور تصورات کو اپنے دل میں اُتار لیتے ہیں اور کچھ اس انداز سے کہ نہ آپ جان سکتے ہیں اور نہ میں جان سکتا ہوں۔ آج کا بچہ اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ اُسے کوئی جنم دے گیا تھا یا وہ برسات کے پہلے قطرے کے ساتھ اس دھرتی پہ ٹپکا تھا وہ اپنے بڑوں سے اپنی اور ان کی پیدائش کے بارے میں سوال پوچھتا ہے اور رسمی جواب حاصل کر کے چپکے سے قلم اُٹھاتا ہے اور اپنے جوابی مضمون میں لکھتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پورے خاندان میں چار پشت سے کوئی بھی قدرتی طریقے سے پیدا نہیں ہوا۔

دراصل کرشنی دیاس سے لے کر وشنو پربھاکر تک سب لکھنے والوں نے گڑبڑ کی ہے۔ وہ اس زمانے سے اتنا ہی پیچھے ہیں، جتنا زمانہ ان سے آگے ہے۔ چلئے وقت کے اعتبار سے سہی، مانئے ہم نے سب کچھ پایا ہی نہیں کھویا بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن اس کھونے میں جو کچھ ہم نے پایا ہے اسے کالیداس، بھوبھوتی اور شیکسپیئر آج نہ پا سکیں گے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اتنا تاؤ نہ دیجئے کہ میں ان بڑے لوگوں کو آج کے نقطۂ نظر سے دیکھوں، میں کس قدر بے بضاعت ہوں۔ ان مہان ہستیوں کے مقابلے میں، لیکن آج کے نوجوان کو میرا بھی مشورہ ہے کہ مجھے

پڑھیں اور پھینک دیں اور واقعی کسی نامحسوس دلیل کی بنا پر مکمل طور پر رد کر دیں۔ اور میں یہ محسوس کر دوں۔ میرا بیٹا بھی ٹھیک ہے اور میں بھی۔ غلط ہوں۔

میرا بیٹا میری اتھارٹی کو نہیں مانتا، کسی کی اتھارٹی کو بھی نہیں مانتا۔ میں روتا ہوں۔ میرے بڑوں اور پیشرؤں کی روحیں کسی آسمان میں کلبلاتی ہیں اور وہ میرے ساتھ مل کر اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اپنے زمانے میں انقلابی تھے اور انہوں نے اتھارٹی کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس کی وجہ سے کڑی مصیبتیں اُٹھائی تھیں۔ کیونکہ ان کے زمانے میں بھی ہماری ہی طرح کے ماں باپ تھے۔ حاکم تھے۔ مذہبی پیشوا تھے۔ انہوں نے بھی وقت کو تھامنے کی کوشش کی تھی اور نئے اخلاق کو دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا۔ آپ اندازہ تو کیجیے کہ میرے بیٹے کو کن چیزوں سے نمٹنا پڑتا ہے، زندگی کی رفتار سے، قدم قدم پر ایک کڑے مقابلے سے، مادری اور روحانی قدروں کی کشاکش سے، پرانے اور نئے کے جھگڑوں سے …… میں نے اگر بہت پڑھا بھی ہے تو میرا ذہن جاگیردارانہ ہے۔ لیکن میرے بیٹے کا نہیں۔ میں ایک خاص قسم کا ادب اور متابعت اس سے مانگتا ہوں جو وہ مجھے نہیں دے سکتا۔ اور دینا بھی نہیں چاہتا۔ میں جب اس کی طرف دیکھتے ہوئے جھلا کر کہتا ہوں۔ تم آج کل کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے، تو میں یہ بھول جاتا ہوں کہ یہی فقرہ مجھے بھی میرے ماں باپ نے کہا تھا۔ ہمارے بڑوں کے زمانے میں سرطان (کینسر) صرف ایک پھوڑا تھا۔ جس پر کوئی مرہم لگایا جاتا تھا اور مصفیٰ خون کی بوتل پینی پڑتی تھی۔

ان کے زمانے میں دباؤ اتنے نہ تھے کہ انسانی شخصیت ایک ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح نظر آئے جب "سکیزوفرینا" کا لفظ ایجاد نہ ہوا تھا۔ خواب آور گولیاں استعمال نہ ہوتی تھیں اور نہ لوگوں کو ایل۔ ایس۔ ڈی جو ہیں یا اس کھمب کا پتہ تھا جس کا رس پی کر انسان کو اپنا ہی لطیف جسم گہرائیوں میں اترتا اور بلندیوں پر پرواز کرتا دکھائی دیتا ہے اور جن بے حد حسین سبزہ زاروں میں وہ جاتا ہے وہ انسان کے اپنے دماغ اور اس کے شعور کی تہیں ہیں۔ جن میں سیلاکانٹ مچھلی سے لے کر آئینسٹائن تک کے سب تجربات چھپے پڑے ہیں اور جہاں تک پہنچنے کے لئے ہمارے رشی منیوں نے ہزاروں سال تپسیا کی۔

یہ کہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ ایک حقیقت ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ یونہی میں نے اپنے آپ کو سفر کرنے کی کوشش کی ہے، تو مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ اگر میں جانتا بھی ہوں کہ سوئیز کی نہر فرانسیسی انجینئر ڈی لیپس نے بنائی تھی تو بھی میں اپنے بیٹے کے سوالوں کا جواب کچھ اس انداز سے دوں گا جس سے اس کی تسلی نہ ہوگی اور میں اس بات کو چھپانے کی کوشش کروں گا میں بھی سب باپوں کی طرح جاہل ہوں اور میرا زمانہ لد گیا ہے۔ میری حیثیت اس وقت اس "ڈیڈی" کی طرح ہوگی جس سے بیٹے نے پوچھا۔ ڈیڈی! یہ مصر کے مینار کیوں بنائے گئے ہیں؟"

"خدا معلوم۔ بس بنا دیئے۔ اگلے وقتوں میں بہت زیادہ وقت تھا لوگوں کے پاس!

" زراف کی گردن اتنی لمبی کیوں ہے ڈیڈی ؟"

" بھائی کسی جانور کی لمبی ہوتی ہے اور کسی کی چھوٹی "

" ڈیڈی ! بچہ صرف عورت ہی کو کیوں پیدا ہوتا ہے ؟"

" کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر مرد کو بچہ پیدا ہونے لگے تو پھر وہ عورت نہ ہو جائے "

" ڈیڈی ! اگر آپ میرے سوالوں سے خفا ہوتے ہیں تو میں نہ پوچھوں "

" نہیں نہیں پوچھو بیٹا، سوال نہیں پوچھو گے تو علم کیسے ہوگا ؟"

میرا بیٹا رات کو کیا سوچتا رہتا ہے ؟ کیوں رات دیر تک اُسے نیند نہیں آتی ؟ کیا صرف بادام روغن یا خواب آور گولیاں ہی اس کا علاج ہیں ؟ کیا اسے سیکس ستاتا ہے ؟ کیوں کہ اس کی عمر ستائیس سال کی ہو چکی ہے اور اس کے چند مطالبے جائز ہیں۔ پھر اس نے شادی سے کیوں انکار کر دیا۔ کیا صرف اس لئے کہ جب تک وہ اس دنیا کی تگ و دو میں اپنا مقام نہ بنائے گا۔ کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہ کرے گا ؟ کیوں ہمارے زمانے میں لوگ اس عقیدے پر شادی کر لیا کرتے تھے کہ عورت لکشمی ہوتی ہے ؟ اس کے آنے سے قسمت کے دروازے اپنے آپ کھل جاتے ہیں۔ اکثر وہ نہیں کھلتے تھے صرف چند تاریک مستقبل والے بچے اس دنیا میں چلے آتے۔

میرے بیٹے کے خیالات کیا ہیں ؟ میں ان تک پہنچنے کی کوشش تو کروں۔ اس کی روح میں اتر کر دیکھوں کہ وہ کیوں اتنا خود غرض ہو گیا ہے ؟ کیوں وہ ..... دوسرے کسی کے باپ کے پیر بھی چھوتا ہے۔ لیکن صبح اُٹھ کر اپنے باپ کی طرف

دیکھتا بھی نہیں ،کیا صرف اس لئے کہ دوسرے کا باپ ایک امیر کبیر آدمی ہے اور اس نے اپنے بیٹوں کو دولت اور شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ حالانکہ میرے بیٹے کے باپ نے چند کالے صفحوں کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیا کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ آج کل کے دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بیٹا بھی راتوں رات لکھ پتی ہو جانا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ پیسہ کمانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے ایک روّیے پر دوسرا روّا رکھنا پڑتا ہے جیسے وہ مذہب اور دوسری رسوم و روایات کا قائل نہیں۔ وہ گرد و پیش کی دنیا کو دیکھ کر اس قسم کی محنت کا بھی قائل نہیں۔ ایسے نظام کا بھی قائل نہیں جس میں کچھ لوگ مرتے رہتے ہیں اور کچھ عیش کرتے ہیں اور

کھلے بندوں کہتے ہیں۔ بزنس میں تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، میرا بیٹا میرا نام استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی شرم نہیں سمجھتا۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ میرا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجبور اور شرمسار ہے میری وجہ سے وہ کسی سے دس روپے بھی نہیں مانگ سکتا میں نے ہنسی کی آڑ میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے کہا "بیٹا تو پھر تم سو مانگا کرو" اور مجھے پتہ چلا کہ وہ میری زندگی میں سے جذباتیت اور شاعریت کو یکسر نکال دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس کے باپ کی اتنی حیثیت تو ہو جائے کہ وہ کسی سے لاکھ دو لاکھ مانگ سکے جس سے وہ ایک فلم بنائے اور اس سے کئی لاکھ کمائے۔

اس قسم کی مادہ پرستی، خود غرضی، سگریٹ، شراب، عورت کی وجہ سے باپ

اپنے بیٹوں کو اپنی زمین جائداد سے برطرف کر دیا کرتے تھے۔ لیکن مادی معنوں میں میرے پاس ہے ہی کیا۔ جس سے بیٹے کو برطرف کر دوں؟ اگر وہ کسی بات سے ناراض ہو کر چلا جائے تو پھر میں ہی اسے ڈھونڈتا پھروں گا اور اگر میں کہیں چلا جاؤں تو وہ مجھے نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لئے میں سخت وحشت کے لمحوں میں بھی چپکے سے گھر چلا آتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں میرا بیٹا کہیں چلا نہ جائے میں اسے برطرف کرنے کی نہیں سوچتا۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے انسانی اصول کے کلبلاتے ہوئے درخشاں مستقبل سے برطرف نہ کر دے۔

خواجہ احمد عبّاس

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں۔ ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسے ہونا چاہیئے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے ہمیشہ انہیں اپنا بزرگ اور پینشر و مانا اور یوں احترام کرتے ہوئے ٹال دیا۔ کچھ اسی قسم کا سلوک انہوں نے بھی میرے ساتھ کیا۔ ادبی سلسلے میں بارہا میری پیٹھ ٹھونکی، تحریری طور پر مجھے تسلیم کیا اور اس کے بعد ٹکسال باہر کہہ دیا۔ حال ہی کی بات ہے جب کہ میں نے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تو بلا تکلف انہوں نے مجھ سے پوچھا "تم رہتے کہاں ہو؟"

عباس صاحب کی ہمدمی کا شرف بھی مجھے حاصل نہیں ہوا جس میں میرا قصور ہے تو ان کا بھی۔ میرے خیال میں انہوں نے میری طرح دوستوں کا انتخاب امتیازی نظریہ سے نہیں کیا۔ ایک واضح ارادے سے کسی صحیح آدمی کو تو قریب لانے کی کوشش نہیں

کی۔ جی ہاں! صحیح آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ خود اپنی طرف ہے تو چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی جو نقد و نظر سے عباس صاحب کی بہتری کا سامان کر سکتے تھے اور خود بھی ان سے سیکھ سکتے تھے جو بھی ان کے پاس آیا۔ انہوں نے آنے دیا۔ یہی نہیں۔ جو ان کے پاس سے گیا اُسے جانے بھی دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی، پیرِ مغاں تھے اور اگر نہیں تھے تو عباس صاحب کے حسنِ سلوک نے ہمیشہ کے لئے انہیں بنا دیا۔ اور جانے والوں کا تو ذکر ہی کیا؟

اس مؤدب فاصلے کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے ان کی ہم مشربی کا فخر حاصل ہے جس سے ہمدمی اور دوستی کہیں دور کی بات نہیں۔ پھر تھوڑا جاننے والے میں اتنا انکسار تو ہوتا ہے وہ کسی کو جاننے کا حتمی دعویٰ نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اس سلسلہ میں بڑی بونگی باتیں کرتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ جو آدمی جتنا قریب ہوتا ہے، اتنا ہی دُور بھی۔

زندگی میں کم ہی آدمی آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل پیدائش سے لے کر آخر دم تک ایک ہی سی رہی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ بہت سے جرائم نہیں کر سکتے۔ میں نے عباس صاحب کو ان کے بچپن میں تو نہیں دیکھا لیکن اپنے۔۔۔۔ قرینہ لوجی کے محدود علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت بھی عباس صاحب اپنے اس لائبریری ایڈیشن کا پیپر بیک ہوں گے اور کچھ نہیں تو پچھلے پچیس برس سے تو میں ان کا منہ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں ذہنی طور پر ان کا قد بڑھا ہے۔۔۔ جسمانی طور پر

آپ وہی کے وہی رہے ہیں چہرے پر جس فہم و فراست کے نشان پہلے تھے۔ وہی اب بھی ہیں۔ ویسے ہی نگاہ اچٹ کر سامنے والے پہ پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی تحریر جس کے نیچے پتلے سے ہونٹ جو خفگی یا کھسیانے لمحوں میں کچھ اس طرح سے ہلتے ہیں۔ کہ انہیں پھڑ پھڑانا کہا جا سکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی ہنسی بے ساختہ ہے مگر ریشمی جیسے استعمال کرتے ہوئے وہ ایکا ایکی رُک جاتے ہیں۔ معتبر آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہیئے۔۔۔ سوپر کے بال پہلے ڈھائی تھے اب دو رہ گئے ہیں اس کے باوجود سکھوں کے خلاف نہیں۔ بلکہ کئی دفعہ میں نے انہیں کسی سکھ کو، رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ لباس میں سادگی ہے اور استغنا کا فن بھی۔ ان کی عام نشست و برخاست کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں تاکید تکلفات پہ نہیں۔ کچھ اور ضروری باتوں پہ ہے۔ جس میں ادب، صحافت، فلم سیاست اور دوسری بیسوں قسم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انہیں اسرائیل اور جمہوریت متحدہ عرب کے درمیان چننے کا حق دیا جائے تو وہ یقیناً جمہوریت کو چنیں گے۔ صدر جمال عبدالناصر کی پیروی کریں گے لیکن شکل ہمیشہ اسرائیل کے بین گورئین سے ملے گی۔

میں نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا جہاں وہ اپنے صحافی دوست ساٹھے کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے یہ دونوں دوست، انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک کا حصہ تھے۔ جس کے ایک جلسہ میں میں عباس صاحب

کو دیکھنے چلا گیا۔ ان دنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا اوپن ایئر تھئیٹر قائم ہوا تھا۔ جہاں خوب ہی ہنگامہ تھا معلوم ہوتا تھا کچھ نہیں تو ادھم کبھی ضرور ہے۔ چنانچہ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب دھکے پڑے۔ خیر، دھکوں کی بات چھوڑیئے۔ وہ تو زندگی کا حصّہ ہیں۔ ہم سب دھکے کھاتے ہیں کبھی مل کر اور کبھی الگ الگ۔

ایک بار پہلے بھی جب لاہور کے بریڈلا ہال میں مہاکوی ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا۔ تو اس سے بھی بڑا سلوک ہوا۔ بھگدڑ میں سینکڑوں پیروں کے نیچے دلا گیا۔ جب بھی میں نے یہی سوچا تھا کیا بڑے آدمی کو دیکھنے کے لئے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟

اس جلسے میں عباس صاحب ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اس لئے نہیں کہ باقی کے فضول اور بے کار قسم کے مرد تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے ملتے اور سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے جیسے صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے۔

"…… اور وہ آزادانہ مہمانوں میں گھومتے اور ان سے ملتے جُلتے رہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا عباس صاحب کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے۔ ایسا کریں گے تو ان کا اپنا دِل ٹوٹ جائے گا۔ اس عمل میں انہیں کتنا ہی بولنا، کتنا ہی وقت ضائع کرنا پڑا۔ وہ اس بات کو بھول ہی گئے اور آج تک بالعموم بھولے ہوئے

ہیں کہ جب تک وہ کسی کا دل نہیں توڑیں گے بات کیسے بنے گی ؟ (دل بدست آور" کہ حج اکبر است!)

جب عباس صاحب کے چہرے پر ایسی ہی طمانیت برستی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ بعد میں وہ "آزاد فلم" ہو جائیں گے اور فلموں میں رہے تو "آزاد فلم" ایک نقطہ اور بھی کم۔ ان کے چہرے پر سب سے اوپر عقیل اور آزاد روی کے نقوش تھے۔ اس سے نیچے پی۔ سی۔ جوشی کی پارٹی لائن اور سب سے نیچے مہاتما گاندھی کی "تلاش حق" پوری کی پوری، جو جھپٹا کر سب سے اوپر چلی آتی تھی۔

اسی دن مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ کسی آدمی کی بڑائی سے بچنے کے لئے اس سے ذاتی طور پر مل لینا ضروری ہے۔ اسے چھو کر دیکھنا لابدی ہے۔ چاہے وہ ہاتھ ملانے کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس عمل میں اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کا انسان ہے۔ صرف اس نے زندگی کے خاص شعبے میں حد سے زیادہ محنت اور ریاضت کی ہے اور ہم نے نہیں کی کہ ہیں تو ذہنی طور پر بھی ہم ان سے ہاتھ ملا سکتے ہیں۔ ورنہ ہم اپنے ذہن میں ایسے آدمی کو کچھ ایسے مافوق الفطرت انتسابات دے دیتے ہیں کہ وہ خواہ مخواہ ہمیں وہ بامن اوتار سوگنا معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اسے انسان کی تربیت میں دیکھ کر، عام انسانوں کی سی حرکتیں کرتے پا کر ہمارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ جس میں اس بےچارے بڑے آدمی کا تو کچھ بگڑتا نہیں۔ ہمارا اپنا قد پہلے سے بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔

عباس صاحب سے مصافحہ کے بعد کم از کم ایک بات کی تسلّی تو ضرور ہوئی کہ جسمانی طور پر ان کا قد مجھ سے بڑا نہیں۔ البتہ رنگ گورا ہے لیکن کبھی نو افریقی۔ قومیں میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھیں گی اور گوروں کا جوا اتار پھینکیں گے (چنانچہ آج میری پیشین گوئی کتنی پیغمبرانہ ثابت ہو رہی ہے!) ۰۰۰ رہی ذہنی قد کی بات تو۰۰ ورزش سے وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان دنوں عباس صاحب نے ابابیل نام کی ایک کہانی لکھی تھی جس کا مجھ پر بہت رعب پڑا تھا۔ لائم او فلاہرٹی نے پرندوں کے بارے میں کچھ خوبصورت افسانے لکھے تھے، لیکن عباس صاحب کا افسانہ ابابیل ان پر بھاری تھا۔ جب میں ڈاک خانے میں بابو (بیک نقطہ مش یا بوشودا) تھا اور میرے نزدیک کاؤنٹر پر منی آرڈر بک کروانے والے سے لے کر عباس صاحب تک سب انگریز وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چنانچہ میں نے لکنت سے پٹی زبان میں افسانے کی تعریف شروع کی۔ عباس صاحب خوش تو ہوئے لیکن پھر انکسار میں ٹال گئے اور میری کہانیوں کی باتیں کرنے لگے اور میں بھول ہی گیا کہ ابھی مجھے ان کی ایک اور کہانی "ایک پائیلی چاول" کی بھی تعریف کرنا ہے کہ انکسار ان دنوں میرے لئے بہت بڑی عشرت کی بات تھی۔ جیسے عباس صاحب کی تعریف میرے نزدیک بہانہ محض تھی اپنی باتیں کرنے کے لئے۔ جب میں عباس صاحب سے مل کر آیا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے اس وقت جانے بوجھے بغیر انہوں نے اپنی عظمت کا کچھ حصّہ مجھے بھی دے دیا ہے۔

میں گورا نہیں ہوا تو لمبا ضرور ہو گیا ہوں۔

اور یہ عباس صاحب میں امتیازی بات ہے ادیبوں میں (میرے سمیت) کم آدمی آپ کو ایسے ملیں گے جو اپنی باتیں کم کریں گے اور دوسروں کی زیادہ۔

ایک دوسرا شخص جو لوگوں کو بظاہر "انا" سے معمور معلوم ہوتا ہے وہ ——— اوپندرناتھ اشک۔ میں جب بھی ان دوستوں سے ملا ہوں، مجھے پتہ چلا ہے کہ ادب کے آسمان پر کوئی نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ یہ اسی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کی چیزیں پڑھ کر سناتے ہیں یا پڑھواتے ہیں۔ تھوڑی سی بحث کے بعد مان بھی جاتے ہیں کہ وہ ستارہ ابھی طلوع ہونے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں ڈر، محض ڈر کے جذبے سے اس ادیب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ چونکہ ڈر کوئی اثباتی جذبہ نہیں۔ اس لئے یا وہ ادیب مجھے طالسطائی اور چیخوف سے بھی بڑا معلوم ہونے لگتا ہے اور یا پھر اپنے سے بھی چھوٹا۔ میری طرح کے جاگیردارانہ ذہن رکھنے والے اور بھی بہت سے ادیب ہیں لیکن ایک فرق ہے۔ میں اپنی اس کمزوری کو جانتا ہوں۔ اور اسے دُور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ لیکن ان میں سے اکثر جانتے ہیں، نہ کوشش کرتے ہیں خیر، وقت بڑے بڑوں کو ٹھیک کر دیتا ہے اور میں اپنے آپ سے مایوس نہیں۔

یہ بات نہیں کہ عباس صاحب اور اشک میں انا نہیں۔ اسے صاحب ہے اور بہت ہے۔ لیکن اسی قدر جس قدر اسے تخلیقی عمل کے لئے ہونا چاہیئے اور

وہیں جہاں اسے ہونا چاہیئے۔ جیسے اکثر لوگوں کا سیکس تمام تر سر میں ہوتا ہے۔ اور ایک معزز خاتون کے مطابق۔ وہاں نہیں، جہاں اسے ہونا چاہیئے عباس صاحب بس انا اتنی ہی ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان سکیں۔ دوسروں سے الگ اور دوسروں کے بیچ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ساتھی لکھاڑ ہی بہت ہیں۔

میں نے عباس صاحب کے بہت سے افسانے پڑھے جن میں سے کچھ یاد ہیں اور کچھ بھول گئے۔ بھول جانا شعور کے سلسلے میں رائے ہو تو ہو لیکن انسانی دماغ ایک کمپیوٹر نہیں۔ اس سے بہت بلند ہے جس کی تفصیل یا بحث اس مضمون کا حصہ نہیں.... عباس صاحب کا افسانہ "بارہ بجے" تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ ایک تو اس لئے کہ اس سے میرا براہ راست تعلق ہے (اگرچہ میں داڑھی کاٹنے اور سگریٹ پینے والا سکھ ہوں) دوسرے اس لئے کہ یہ افسانہ.... پنجاب کے فسادوں سے متعلق تھا۔ جن میں سے میں بھی گزرا ہوں۔ اور ریل کی چھت پر ننگے بدن بیٹھ کر تقسیم کے وقت ہندوستان پہنچا ہوں۔ اس افسانے میں عباس صاحب نے اپنے ہی طرز کی حسابی مساوات میں برابر کے سکھ اور... مسلمان مارے تھے۔ لیکن اس پر بھی سکھوں کی تسلی نہ ہوئی اور مجھے اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے عباس صاحب کے حق میں بیان دینا پڑا۔ آخر میں عباس صاحب کی جان بچ گئی۔ اب آپ نے بھی عباس صاحب کو پڑھا ہے۔ ان کی

فلمیں دیکھی ہیں۔ آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ میں نے اچھا کیا یا برا؟

جب تک عباس انڈین پیپلز تھیٹر کے دوسرے ساتھیوں سے مل کر ہندوستانی فلم کا کلاسیک "دھرتی کے لال" بنا چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ "دھرتی کے لال" پہلی ہندوستانی REALISTIC فلم تھی بلکہ اس نے اپنے ملک کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑا اور بیرون ملک کے باشندوں کی توجہ اس المیئے کی طرف دلائی جس کا نام اس زمانے کا ہندوستان تھا "آجکل" بھی تکمیل پا چکی تھی۔ اس میں بھی عباس صاحب کے ان افسانوں اور ناولوں کی قسم کا ایک پیغام تھا جو تائید کی کثرت سے پیغام نہیں رہ جاتا۔ آدمی کو چڑا دیتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بدصورت نہیں سمجھنا چاہتا "انہونی" پہلی غیر جانبدار فلم تھی جو بہت حد تک کامیاب رہی۔

تقسیم کے بعد میں بمبئی چلا آیا تو اکثر عباس صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند تحریک ان دنوں شباب پر تھی۔ عباس صاحب اس کے راہبر تھے اور راہی بھی۔ کبھی انہیں اس تحریک کی زیادتی معلوم ہوتی تھی اور اکثر کمی۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ جب کہ غریبوں اور ناداروں کے حق میں ایک مبلّغ کی حد تک شور مچانے والے عباس صاحب کو پارٹی مینڈیٹ کے مطابق تحریک سے عاق کر دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ تب میں نے پہلی مرتبہ عباس صاحب کو اس قدر غصّے میں دیکھا.... جب ان کے ہونٹ بھینچ بھی رہے تھے۔ چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ تیز تیز باتیں کئے جا رہے تھے۔ آواز جو پہلے ہی کھسیائی ہوئی تھی اور کھسیا گئی۔

لیکن پانی پت کا ہونے اور اپنے آپ کو پنجابی کہلوانے کے باوجود عباس صاحب کے منہ سے ایک بھی گالی نہ نکلی کیونکہ وہ تہذیب کا تقاضہ نہ تھی۔ ان دنوں ہم "چور" کا رول ادا کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ جس طرف پلڑا بھاری ہو جھک جائیں۔ کچھ ہمت اور شخصیت کی کمی اور کچھ دماغی البطال۔ بس جو اسٹالین نے کہہ دیا وہ قرآن ہے۔ کبھی کبھی محسوس بھی کرتے تھے کہ یہ سیل (CELL) کیا بلا ہے؟ جس میں بیٹھے ہوئے لوگ سوچے بغیر ہی ہماری قسمت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں جس کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ آپ تحریک سے خارج، حالانکہ آپ کی تحریک کا پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ کم از کم براہ راست نہیں اس پہ طرفہ یہ کہ غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں نکلتے ہیں۔ کیونکہ وہ فیصلہ ایک آدمی کا نہیں کئی پنچوں کا ہوتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں پنچ پرمیشر ہوتا ہے۔ پھر ہوشیاری کا یہ عالم کہ ان پنچوں میں ایک ادیب قسم کا آدمی بھی ہوتا ہے ایسا آدمی جو ادب اور فن اور اس کے عوام کے لئے مفید یا غیر مفید ہونے کی سب حدیں جانتا ہے اور پھر اس قدر لوچ بھی ہے کہ برسوں بعد پارٹی لائن کے غلط ہونے پر بھی معافی مانگ سکے ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو اپنی ناسمجھی اور ناکمزوری کی وجہ سے خائف تھا لیکن دوسرے بھی خاموش تھے جو مجھ سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔ وہ عباس صاحب کے منہ پہ کھری کھری سناتے تھے اور بعد میں اس کا تذکرہ کر کے خوش ہوتے تھے۔ اپنی ہمت پہ خود۔ لیکن عباس صاحب کو ان کی اور اپنی

تحقیق کی بہ نسبت اپنے جذبے پہ یقین تھا۔ اس لیئے نہیں کہ وہ اسٹالین سے لے کر کیفی اعظمی تک اپنے آپ کو زیادہ قابل سمجھتے تھے بلکہ اس لیئے کہ حقیقت پر پہنچنے کے لیئے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی۔ محبت ۔۔۔ جسے صحیح آدمی کبھی کبھی خود بھی شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور سرکس کے رُوپ واکر کی طرح زندگی کے رستے پر اپنے آپ کو فکر اور جذبات کے درمیان متوازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بہرحال اپنے آخری تجزیئے میں وہی کسوٹی نسبتاً ٹھیک اُترتی ہے کیونکہ اس کے پیشِ نظر ادب اور سیاست ریاضی کے گنجلک سوال نہیں رہ جاتے اور نہ انسان کے سیدھے سادے مسئلوں کی توضیح و تفہیم اسٹالین کے پوجنے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نہ ماؤ ماؤ کی طرح ہندوستان پر حملے کی۔ تاکہ روس کو کان ہوں ۔۔۔ چنانچہ ان سب باتوں کے باوجود عباس صاحب کے قدم اپنے راستے پر سے نہ ڈگمگائے لیکن، جب تک، بقول شخصے۔ بہت سا پانی ہمارے دریاؤں میں بہہ گیا تھا۔

ہمارے دوسرے بہت سے دوستوں کی طرح عباس صاحب بھی مقصدی ادب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی دل اور دماغ کو ہم آہنگ کر کے لایا تو نتیجہ اچھا نکلا ورنہ محض آواز ہو کر رہ گیا، بلکہ شور ۔۔ عباس صاحب کے کئی افسانے اور دوسری تحریریں ایسی بھی ہیں جو موثر نہیں ہو تیں اور اگر ہوتی ہیں تو کردار کے اعتبار سے سخت خارجی، ہنگامی پہلو لئے ہوئے۔ جس کے

باعث ان کی گونج جا ہی معدوم ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کے مقصد اور دوسروں کے مقصد میں بھی فرق ہے۔ انہوں نے لڑکی کے سہارے تو ایک طرف لکڑی کے سہارے بھی انقلاب تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس عمل میں بہت سوں کی طرح منقلب ہوئے ہیں نہ انہوں نے زبان اور جمالیات کو اپنے معنی پہنائے ہیں بلکہ اپنے مقصد کی جستجو میں کچھ یوں سیدھے گئے ہیں کہ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ نظروں سے راستے کی تزئین کرتے جانا عین فن ہے۔ ان کی بہت سی تحریریں پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے عباس صاحب بہت جلدی میں ہیں۔ انہیں ایک کام تھوڑا ہے؟ سینکڑوں ہیں۔ ان کے پاس وقت نہیں اور زمانہ ہے کہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ اپنی رفتار قائم رکھنا ایک خالص سائنسی عمل ہے۔ میں اس بات کو فلسفیانہ سطح پر لاتے ہوئے عرض کروں گا کہ وقت کو تھامنا ہی پڑے گا۔ ورنہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جیسے ہمارے بڑوں نے منتروں کے ذریعے گویا نی تھام لی تھی اور یکسوئی اختیار کر کے کالی بھگوان کی مار سے بھی پورے چلے گئے تھے۔ اسی طرح کا عمل ہمیں بھی روا رکھنا ہوگا۔ ہم ادیبوں کا وا شنگ اور ہمارا راکٹ یہی ہے کہ جس پر سوار ہو کر مہر و ماہ سے بھی اوپر جا سکتے ہیں۔۔۔۔ ایک دن آئے گا جب کہ جدلی مادیات کے دعویداروں کو بھی مقصد کی تحلیل اور اس کے۔۔۔۔ اندرونی تضادات کو خاطر میں لانا پڑے گا۔

عباس صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ ان کی

بیگم۔ مرحومہ بھی ایک نہایت ہی پیار کرنے والی عورت تھیں۔ ہم ادیبوں سے وہ بھائیوں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ جوہو میں میرا ایک کمرہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں میں بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا۔ عباس صاحب کا گھر راستے میں پڑتا تھا.... کبھی ان کے ہاں رُکتا تو وہ بڑی شکایت کرتیں کہ قریب سے گزر جاتے ہو اور آتے تک نہیں ان کی وفات سے ہمیں قلق ہے تو عباس صاحب کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جنسی زندگی کے بارے میں عباس صاحب کا نظریہ ایک عام، نارمل مہذب آدمی کا نظریہ ہے۔ وہ زندگی کے اس حصّے کو بالکل منفرد سمجھتے ہیں۔ انگریزی قول کے مطابق نہ تو وہ کسی کے گندے کپڑے پبلک میں دھوتے ہیں اور نہ اپنے دھونے دیتے ہیں (مطلب، اگر ان کے پاس ایسے کپڑے ہیں تو....! ضرور ہوں گے)

ایک چیز جس نے عباس صاحب کے سلسلہ میں مجھے ہمیشہ ورطہ حیرت میں ڈالا ہے، وہ ہے ان کے کام کرنے کی حیرت انگیز طاقت اور قوت۔ کہانی لکھ رہے ہیں اور ناول بھی۔ قومی یا بین الاقوامی سطح پر فلم بھی بنا رہے ہیں اور صحافت کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ بلٹز کا آخری صفحہ تو بہر حال لکھنا ہی ہے لیکن ساتھ کرشچوف کی سوانح بھی ہو گئی۔ پنڈت نہرو سے بھی مل آئے جن سے عباس صاحب کے ذاتی مراسم ہیں۔ پھر پینتیس لاکھ کمیٹیوں کا ممبر ہونا سماجی ذمہ داری کا ثبوت ہے۔

اور یہ بات ممبر شپ تک ہی محدود نہیں ہر جگہ پہنچیں گے بھی تقریر بھی کریں گے۔
پورے ہندوستان میں مجھے اس قسم کے تین آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پنڈت
جواہر لال نہرو، دوسرے بمبئی کے ڈاکٹر بالیگا اور تیسرے خواجہ احمد عباس۔
جن کی یہ قوت اور استعداد ایک عام آدمی کی نہیں۔ چنانچہ جب میں نے ایک بار
عباس صاحب کے سامنے اپنے اس حیرت کے جذبے کا اظہار کیا تو انہوں نے
معمول کے رسمی انکسار سے ٹال دیا اور بولے "بھئی تو ہر بات میں تپلا پن ہے" اور
پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "آج کل کیا لکھ رہے ہو؟"
بیچ میں کسی نے ٹوک دیا۔ اس لئے عباس صاحب نے میری آنکھیں نہ دیکھیں
جو نمناک ہو گئی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں بیس پچیس
برس کا وقفہ آچکا تھا اور میں اپنے بارے میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔

مہمان

میں شروع ہی میں مانے لیتا ہوں کہ مجھے مہمانوں سے نفرت ہے سخت نفرت!
اگرچہ میں اتنا پڑھا لکھا نہیں لیکن یہ بات ضرور جانتا ہوں کہ ہماری سبھتا میں
مہمان کا بہت بڑا درجہ ہے یہ تو مہمان کی اپنی بدکرداریوں اور اس کے نام میں
لگی ہوئی فالتو سی دم، نے گڑبڑ کر دی۔ ورنہ وہ تھا ہی مہان.... آپ ذرا اسے
لکھ کر تو دیکھئے۔

اتتھی ستکار کا ہماری پستکوں میں بڑا مہتو ہے۔ جگہ جگہ اس بات کی پریرنا
کی گئی ہے کہ مہمان کیسا بھی ہو اُسے بھگوان کر کے مانا جائے اس زمانے میں شاید
خیالات کی زیادتی تھی یا سوچ بچار کی کمی کہ اُن درشن شاستروں کے لکھنے والے
گھوم گھام کر پھر شبد مہمان پہ چلے آتے تھے۔ غالباً وہ یہ سب اس لئے کرتے تھے
کہ خود ان کے پاس پہننے کو لنگوٹی تھی اور نہ کھانے کو روٹی اور وہ جانتے تھے کہ

ایک نہ ایک دن ان کو کسی کا مہمان ہونا ہی پڑے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے۔ کہ مہمان کا درجہ بھگوان کا ہے تو میں بڑی نمرتا سے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ مجھے بھگوان سے بھی نفرت ہے۔

جس زمانے میں ہمارے شاستر لکھے گئے تھے، اُس زمانے میں جگہ کی کیا کمی تھی؟ سوائے وشو لتا کے اور تھا ہی کیا؟ نیچے زمین، اُوپر آسمان اور بیچ میں مہمان، چاہے درجنوں لٹک جائیں۔ آج کس کے پاس ۱۰×۱۰ فٹ سے بڑا کمرہ ہے؟

شامت اعمال اگر مہمان چھ فٹ کا آجائے تو آپ کو ٹانگیں سکیڑ کر ا نہیں، چھاتی سے لگا کر باقی کے چار فٹ میں گزارہ کرنا پڑے گا۔ حالانکہ مرنے کے لئے بھی آدمی کو کم سے کم چھ فٹ جگہ چاہیے جس میں کہ مہمان پڑا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ صبح اُٹھیں گے تو آپ کی ٹانگیں چھاتی کے ساتھ ہی لگی رہ جائیں گی اور جب انہیں پھیلانے کی کوشش کریں گے تو یوں لگے گا جیسے آپ پھر سے پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے وقتوں میں ہمارا پورا فلسفہ مہمان کی مدد کرنے پر تلا ہوا تھا جب لوگ جنگل میں جا کر کند مول وغیرہ کھا لیتے تھے اور اسی میں سنتشٹ ہو جاتے تھے۔ لیکن آج کا دشٹ مہمان چکن روسٹ سے کم بات ہی نہیں کرتا۔ کچھ اس انداز سے چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو الٹی ریستوران میں بیٹھے ہوئے

پاتے ہیں آخر دم تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ بل وہ دینے والے ہیں۔۔۔۔ یہ مسئلہ آپ کا ہے مہمان کا نہیں کہ ڈیش بھر میں کھانے کو نہیں۔ راشننگ کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے۔ بیوی کی شکل دوکان پہ کھڑے کیوُ سی ہو گئی ہے۔ پھر پرُانے زمانے میں انسان زیادہ تھے اور مہمان کہیں اکّا دکّا ملتا تھا۔ لیکن آج مالیتھوسی کے عقیدے کے مطابق اس بھوکی ننگی دنیا میں مہمان ہی مہمان رہ گئے انسان کہاں نظر آتا ہے! اس زمانے کے مہمانوں میں پھر کوئی آنکھ کی شرم بھی، حیا بھی، دوسرے کی تکلیف کا احساس تھا۔ لیکن آج کل کے مہمان؟ ارے توبہ آپ تو نہیں مجھ سے بہتر جانتے ہیں؟ کیونکہ ہندوستان میں کوئی ایسا آدمی نہیں جسے اس موذی سے پالا نہ پڑا ہو وہ سوت کی طرح سے ہر ایک پہ آتا ہے۔ جینا جھوٹ ہے اور مرنا بھی جھوٹ صرف مہمان سچ ہے۔ آج کل کے مہمان کو تو پس گولی مار دیئے۔ ذرا سوچیئے۔ تو ہم جو خود اس دنیا میں کل دو ہی دن کے مہمان ہیں۔ اپنے اوپر ایک اور مہمان کو لے آئیں جو جیتے جی مرنے سے پہلے جانے کا نام ہی نہ لے؟

نا صاحب۔ گھر میں مہمان لانے سے تو اپنی بیوی پہ سوت لے آنا اچھا۔ اس دنیا میں تکلّف کی بھی ایک جگہ ہے۔ مثلاً آپ کسی کے گھر کھانا کھائیں تو شوربے میں ڈوبے ہوئے دو آلوؤں کے بارے میں ضرور کہنا پڑے گا واہ صاحب! مزا آگیا۔ برسوں کے بعد ایسا لذیذ کھانا نصیب ہوا ہے۔ یا رخصت ہوتے ہوئے اپنے میزبان کی بیوی کے بارے میں کہنا ہو گا۔ آپ کی بیوی بڑی CHARMING ہے۔ سمجھدار

میاں تو اس بات کو سمجھتا ہے وہ صرف ایک بار مڑ کر اپنی بیوی کو دیکھتا ہے۔ اور پھر گھبرا کر بوٹ کے تسمے بند کرنے لگتا ہے لیکن مہمان؟ آپ کہیں غلطی سے بھی اسے کہہ دیں آپ غریب خانے پر تشریف لے چلیے۔ وہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے تو پھر دیکھئے کیسے وہ آپ کے ہاں انتقال فرما جاتے ہیں اور وہیں اپنی قبر بنا کر رہتے ہیں آپ کو آپ کی بیوی، آپ کے بچوں کا مجاور بنا کر چھوڑتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد آپ کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے ہی گھر میں مہمان ہو گئے۔ میزبان تو وہ ہیں، بذاتِ خود!

اپنے دل میں پھر سے گھر کا احساس جگانے کے لئے آپ کے پاس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگلے پھیرے میں آپ اس کے گھر میں مہمان ہو جائیں اور ہر بات میں ان کی جھونپڑی کو بار بار دولت خانہ کہیں "تشریف رکھیئے"...."پہلے آپ" اور اس قسم کے جملوں کا آزادانہ استعمال کریں۔ پھر ایک اور بات جو اِن سے سہواً چھوٹ گئی۔ اس کی بیوی سے عشق بھی کریں اس لئے نہیں کہ آپ کا جی چاہے گا بلکہ اس لئے کہ اس کمینے کو پتہ تو چلے کہ کسی دوسرے کے گھر میں مہمان کیسے ہوا جاتا ہے؟

بمبئی کے فلیٹوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں۔ سالے بہت ہی فلیٹ ہیں۔ ان میں اگر آپ ایک چارپائی رکھ دیں تو دوپائے والے کے لئے کہیں کوئی گنجائش نہیں۔ آخر چارپائی تک پہنچنے کے لئے تھوڑی جگہ تو چاہیئے ہی بہر حال وہ

کھاٹ جسے آپ کی بیوی جہیز میں لائی تھی اور جسے آپ پلنگ نہ کہیں تو وہ مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ مہمان کو دینا پڑتی ہے اور خود نیچے سونا پڑتا ہے۔ بد قسمتی سے اگر آپ کے مہمان ساتھ اپنی بیوی کو بھی لائے ہوں تو پھر آپ اُوپر سو سکتے ہیں، نہ نیچے، ہاں، تو جب آپ مہمان صاحب کو چارپائی پر سونے کے لئے کہیں گے تو پہلے وہ ضرور کہے گا۔ نہیں صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ پلنگ پر سوئیے میں نیچے سو جاتا ہوں لیکن اس کی نیت ہرگز ایسی نہ ہو گی۔ وہ جانتا ہے نا کہ اس کی خاطر کر کے میزبان اپنے کو تو یہی کا تو پالن کر رہا ہے اس کی اس پیش کش سے انکار کیا تو بے چارے میزبان کے دل پر کیا بیتے گی؟ چنانچہ وہ پلنگ پر ٹانگیں پھیلا کر مزے سے سو جائے گا۔ . . تھوڑی دیر بعد آپ کو یوں لگے گا جیسے دشمن کا ریڈیو براڈ کاسٹ کر رہا ہے لیکن، آپ کو ڈنہ جاننے کی وجہ سے اسے سمجھ نہیں سکتے۔ پھر آپ کو اچانک خیال آئے گا۔ نہیں بھائی اس WAVE LENGTH پر تو پہلے ہی بیسیوں نشریات سُن چکے ہیں۔ یہ تو مہمان کے خراٹے ہیں۔

چنانچہ مہمان صاحب سو رہے ہیں۔ ہمیشہ کی نیند نہیں۔ صبح وہ پھر جگ جائیں گے ایک نہیں نیند آئی تو آپ کو اور آپ کی بیوی کو جو سوچ رہے ہیں کہ کل ان کو کیا کھلائیں گے؟ آپ سوچتے تو نیلا تھوتھا ہیں اور لاتے سیب ہیں۔ جن کا مُنہ بھی مہنگائی کے اس زمانے میں آپ نے مہینوں سے نہیں دیکھا۔ پھل بیچنے والا پیشہ ور آدمی ہے وہ

آپ کو دیکھتے ہی تاڑ جاتا ہے کہ ہو نہ ہو ان کے گھر میں کوئی مہمان آیا ہے اور انتھی، سنسکار کی بھاؤنا اِن کے من میں دیا کل ہو اٹھی ہے چنانچہ وہ سیب تو ایک دیتا ہے اور روپے دو مانگتا ہے جیسے اکیلا وہی ایک سیب ہے جو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کشمیر سے آیا ہے۔ پھر آپ آم خریدنے کا فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ وہ مقابلے میں سستا پڑتا ہے۔ گھر پہنچ کر آپ اس آم کی بہت سی قاشیں کاٹ کر مہمان کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ انہیں ایک کے دو معلوم ہوں۔ مہمان ایک بار پھر آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ چنانچہ پڑ پڑ وہ سارے کا سارا آم چٹ کر جاتا ہے آپ سوچتے ہیں شاید وہ سمجھ رہا ہے کہ اندر اور بھی بہت سے آم ہیں وہ نہیں جانتے کہ اندر صرف بیوی ہے جو غصے سے کانپ رہی ہے اور اس کی شکل انناس کی سی ہو گئی ہے۔

مہمان کے گھر میں آنے سے سب سے بڑی بے ہودگی جو ہوتی ہے وہ ہے آپ کے سب راز، سیکولر کھل جانا۔ آپ گھر میں آدھی کھائیں یا ساری یا بھوکے ہی سو رہیں لیکن مہمان کے آتے ہی آپ کی قلعی کھل جاتی ہے آپ کتنا ہی اس سے چھپانے کی کوشش کریں مگر وہ سب ایسے ہی بے کار ہے جیسے کارک کو پانی میں ڈبونے کی کوشش کریں... مہمان اس وقت اندر سے خوش لیکن باہر سے اداس دکھائی دیتا ہے اور اکثر یہ جملہ کہتا ہے... "کیا ہوا بھائی، گھروں میں ایسا ہوتا ہی ہے..."

وہ ہمدردی کر رہا ہے، جسے آپ سخت ناپسند کرتے ہیں جب تک آپ پڑوس سے سو روپے کا نوٹ پکڑ سکتے ہیں اپنی گھڑی بیچ سکتے ہیں، بیوی کی چوڑیاں گروی رکھ سکتے ہیں کسی کو ہمدردی جتانے کا کیا حق ہے؟ اگر آپ کسی نہ کسی طرح ... حقیقتِ حال چھپانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو پھر مہمان بڑے شاطرانہ انداز میں کرید نے کی کوشش کرتا ہے۔

"کیوں بھائی! کاروبار کا کیا حال ہے؟"

آپ جواب دیتے ہیں ... "اچھا ہے"

"کوئی ترقی ورقی نہیں ہوئی؟"

"ہوئی کیوں نہیں؟ ... ہر سال ہوتی ہے۔ جیسے ہر معقول ہندوستانی عورت کے بچہ پیدا ہوتا ہے ... ہی"

چنانچہ ہنسی میں بہہ جانے کی وجہ سے آپ کو بالکل اندازہ نہیں رہتا کہ آپ کیسے دھیرے دھیرے مہمان کی سازش میں آ رہے ہیں۔ وہ آپ کے بھونڈے مذاق پر آپ سے کہیں زیادہ ہنستا ہے اور اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے اور پھر ایکا ایکی آپ کو پورے طور پر نہ دیکھتے ہوئے اپنے ترکش سے ایک اور تیر چھوڑتا ہے ... "اب تو تنخواہ تین سو روپے مہینہ ہو گئی ہو گی؟"

آپ کی رگِ حمیت ایک دم پھڑک اٹھتی ہے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ آپ اپنے آپ کو کہتے ہوئے پاتے ہیں ... "تین سو؟ پانچسو تو میری پچھلے برس تھی" ... جبھی

آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کیا حماقت کی۔ خود کو کنوئیں میں گرا کر اب آپ نپٹنے کے لئے بیکار ہی ہاتھ پیر مارتے ہیں اور کہتے ہیں "پانچسو میں آج بنتا ہی کیا ہے ؟ کچھ انکم ٹیکس کٹ جاتا ہے، کچھ انشورنس، پراویڈنٹ فنڈ میں چلا جاتا ہے کچھ بیوی بکیٹ کے لئے رکھ لیتی ہے تاکہ اس بیٹی کی شادی کر سکے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔" لیکن صاحب آپ کچھ بھی کیجئے۔ مہمان اندازہ لگا چکا ہے کہ آپ کے گھر میں اور کتنے دن رہا جا سکتا ہے۔

ہر معقول آدمی کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے کیونکہ مرد عورت کا رشتہ ہی جھگڑے کا ہے لیکن جب مہمان گھر میں آتا ہے تو وہی جھگڑا مہا بھارت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بیوی آپ سے کتنی نفرت کرتی ہے اِس کا اُس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک مہمان گھر میں نہ آئے۔ جیسے آپ کو بھولنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ایسے ہی بیوی یاد رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ جانے کب کا بغض آپ کے خلاف سینے میں لئے بیٹھی ہے جو مہمان کے آتے ہی پنڈورہ بکس کی طرح آپ کے سر پر اُلٹ دیتی ہے۔ مہمان سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے وہ کہتی ہے "دیکھئے بھائی صاحب دن میں چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں اور اس پہ دُودھ کا ایک گلاس نہیں پیتے ۔ ۔ ۔ آپ بتایئے ان کو خشکی ہو گی کہ نہیں ہو گی ؟ نہ ناشتے کا کوئی وقت ہے نہ کھانے کا ۔ ۔ ۔ اب پینے کی نئی لت پڑ گئی ہے اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی مہمان آئے اور ان کے پینے کا بہانہ ہو جائے ۔ ۔ ۔ آج تو میں انہیں ہاتھ

بھی نہیں لگانے دوں گی"

"کیسے؟ مہمان شرارت سے کہتا ہے۔

بیوی کچھ مسکرانے اور کچھ شرماتے ہوئے کہتی ہے "بوتل کو، اور کیسے؟ آپ بھی بالکل نہ پیجئے گا، بھائی صاحب"

مہمان تھوڑا گھبرانے لگتا ہے اور لہجے میں وہ پیار لے آتا ہے جو وہ اپنی سگی بیوی کے لئے کبھی نہیں لایا... "کبھی کبھی پی لینے میں کوئی حرج نہیں، بھابی، امرد لوگ...."

بیوی ایکا ایکی میز پر ہاتھ مار کے کہتی ہے "نہیں"

"ہاں"، میں جھاپا کہتا ہوں اور بوتل ڈھونڈنے چل نکلتا ہوں جو بیوی نے گودریج کی الماری میں چھپا رکھی ہے اور تالہ لگا دیا ہے۔ میں کنجی مانگتا ہوں اور وہ ٹھنٹ دکھاتی ہے۔ میں جانتا ہوں چابی کہاں ٹھنسی ہے۔ لیکن مہمان کے سامنے وہاں سے نکال نہیں سکتا۔ چونکہ میرے شوہری وقار کو ٹھیس لگتی ہے اسلئے میں آگ بگولہ ہو جاتا ہوں اور بیوی کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہوں۔ یہ عورتیں!... آپ دو روپے کمائیں اور ایماندار آدمی کی طرح آتے ہی ایک روپیہ ان کے ہاتھ میں تھما دیں۔ باقی کے روپے میں آپ بس کا کرایہ رکھیں اور صرف اٹھنی اپنے موج میلے کے لئے۔ جب بھی ان کی نگاہ آپ کی اٹھنی پر رہے گی۔ مرد سے یہ آخری سانس تک نچوڑ لیں گے اور جب وہ مر جائے تو اونچی اونچی آواز میں روئیں گی

اس لئے نہیں کہ وہ مر گیا ہے بلکہ اس لئے کہ اب پکوڑیں گی کیسے ؟"

"بکو مت"۔ بیوی کی بلند آواز آتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی ہے ابھی سے اسے فکر پڑ گیا ہے کہ یہ گیا تو روپیہ کہاں سے آئے گا؟ لیکن آپ اپنا ٹیمپو کم نہیں ہونے دینا چاہتے۔ آپ مہمان سے کہتے ہیں.... آپ ہی بتایئے... بھائی صاحب... ہر بیوی شادی کے دس سال میں یہ ہو جاتی ہے اُس دلہن کو دیکھئے جسے آپ برسوں پہلے گھر لائے تھے اور جس سے والہانہ پیار کیا تھا۔ دو گھونٹ پینا ضروری ہیں یا نہیں ؟ یہ ذلیل سا گھر ہمارا... جب میں پی لیتا ہوں تو مجھے یہ سا چیوالیہ معلوم ہونے لگتا ہے اور یہ گندہ سا محلہ ہینگنگ گارڈن !" پھر میں آنکھوں میں شعلے اور انگارے برساتے ہوتے بیوی کی طرف دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں "دیکھو شانتی ! مجھے آکاش وانی ہو رہی ہے۔"

بیوی آکاش وانی کا مطلب سمجھتی ہے اس لئے ڈر کے مارے چابی میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے لیکن اس کے بعد جو ہتھیار میرے خلاف استعمال کرتی ہے اس کے سامنے آکاش وانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ رونے لگتی ہے اور مہمان سے مخاطب ہوتی ہے ــــ "آپ کو کیا بتاؤں بھائی صاحب ! جب یہ پی لیتے ہیں تو آدمی نہیں رہتے"

"کیا ہو جاتے ہیں ؟" وہ پوچھتا ہے۔

بیوی ہچکچاتے ہوئے کہتی ہے "باہر جاتے ہیں"

"باہر جانے میں کیا حرج ہے؟" مہمان عارفانہ تجاہل کے ساتھ کہتا ہے "باہر کی کھلی ہوا...."

"اوہو۔ آپ نہیں سمجھتے۔"

"اوہ" مہمان کہتا ہے، جیسے وہ سمجھ رہا ہے۔

"آپ ایسے نہیں، تو سمجھتے ہیں۔ دُنیا میں کوئی بھی مرد ایسا نہیں؟" اور پھر گھگھیا کر رونے لگتی ہے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ ذلیل اور گھٹیا مہمان ہم میاں بیوی پر جج بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ بیوی مجھے نقطوں سے بھری ہوئی گالیاں دیتی ہے اور میں اسے بے نقط سناتا ہوں۔ مہمان بیچ بچاؤ کرتا ہے۔ باہر سے دُکھی مگر اندر سے سُکھی نظر آتا ہے آخر وہ مجھے بے تحاشہ صلواتیں سُنانے لگتا ہے..... شرم آنی چاہیئے آپ کو.... ہم نے ہزاروں عورتیں دیکھی ہیں، لیکن شانتی ایسی دیوی نہیں دیکھی۔ آپ اگلے سات جنم تک بھی لگے رہیں تو ایسی ستی ساوتری آپ کو نہ ملے گی۔"

"اگلے سات جنم؟ میں پچھلے سات جنم سے لگا ہوا ہوں"

"کیا کہا؟"

"پچھلے سات جنم سے ستی ساوتری کی تلاش میں ہوں اور اب جا کر مجھے یہ ملی ہے شانتی اب تو مجھے موکش ملنے والا ہے۔

بیوی عقیدت کے ایک جذبے سے مہمان کی طرف دیکھتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس گھر میں مہمان کی نوکری پکی۔ یہ تو موٹی عقل کا مہمان بھی جانتا ہے کہ کسی کے گھر میں رہنا ہے تو بیوی کے ساتھ بنا کر رکھو۔

اب وہ مجھے اور بھی بڑا بھلا کہنے لگتا ہے۔ بیوی چونکہ مرد کا EGO ہوتی ہے اس لئے میاں اُوپر سے بے حد خفا ہوتا ہے اور بھیتر سے خوش۔ بیوی کے سلسلے میں اسے کھا کھا کر اتنی خوشی نہیں ہوتی۔ جتنے جوتے کھا کر ہوتی ہے۔ ہر بیوی کسی انتقامی جذبے سے چاہتی ہے کہ مرد کو وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ نانی یاد آ جائے اور پھر وہ بے دست و پا ہو کر اس کی شرن میں چلا آئے۔ جب وہ اسے ایسا پیار دے جو ماں ہی اپنے بچے کو دے سکتی ہے، جب وہ پڑ دس کے گلوا سے پٹ پٹا کر گھر آتا ہے۔

لیکن آپ کا مہمان تھوڑی ہی دیر میں آپ کا سب مزا کرکرا دیتا ہے۔ وہ آپ کو آنکھ مار کر ایک طرف لے جاتا ہے اور بالکونی پہ لے جا کر بڑی رازداری سے کہتا ہے "آپ بھی ایک ہی ہپسک ہیں۔ ہوتی میری بیوی تو ایک جھانپڑ دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔"

مہمان کو گھر سے بھگانے کا ایک ہی طریقہ ہے اس کے کپڑوں پہ سیاہی انڈیلنے روٹی میں ربت ڈالنے، گھر کا مین سوئچ آف کر دینے کے سب طریقے پرانے ہو چکے ہیں۔ جدید طریقہ یہ ہے کہ خود ایک دم گھبرا جاؤ، جس سے آپ کا مہمان بھی

گھبرا جائے گا۔ اس کی اتنی خاطر کرو کہ وہ توبہ توبہ بول اُٹھے اس کا پاؤں ہی زمین پر نہ پڑنے دو۔ اس کے منہ سے "پ" نام کا حرف نکلے تو دوڑ کر پانی کا گلاس لے آؤ۔ پلنگ پہ بیٹھا وہ زمین کی طرف دیکھے تو سلیپروں کی جوڑی اُٹھا کر سامنے رکھ دو۔ وہ آپ سے بار بار معافی مانگے گا لیکن اس بات کا آپ پہ ذرا بھی اثر نہ ہو۔ باتھ روم کا بٹن آپ دباؤ نل بھاگ کے کھولو اور ایسے ہیں دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لو۔ غلطی سے کہیں وہ خود ہاتھ دھونے لگے تو ایک تولیہ لے کر کھڑے رہو۔ ٹٹی کا لوٹا خود ہاتھ میں لے کر سامنے بیٹھ جاؤ اور اس کے منت کرنے پر بھی نہ ٹلو۔ لیکن یاد رہے یہ سب نسخے باریک عقل کے مہمانوں پہ چلتے ہیں۔ موٹی عقل کے مہمانوں پہ نہیں پچھلے مہمان کو میں باریک عقل کا سمجھا تھا لیکن وہ موٹی عقل کا نکل آیا۔ میرے سب کرنے کے بعد اس نے منڈی ہلائی اور کہا۔ "آپ بڑے دیوتا آدمی ہیں"۔ جب میری سمجھ میں آیا کہ میں کیا ہوں؟

پھر مہمان کے ساتھ جو اس کی بیوی آتی ہے وہ عجیب ہی چیز ہوتی ہے نہ جانے آپ کیسے اُسی وقت اندر کے کمرے میں جاتے ہیں، جب وہ کپڑے بدل رہی ہوتی ہے وہ آپ کو دیکھتے ہی ہڑبڑا کر ایک طرف بھاگتی ہے۔ آپ کھڑکھڑا کر دوسری طرف۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی رہی سہی ساڑھی بھی کھل جاتی ہے اور جب آپ دونوں سخت وحشت کے عالم میں اُلٹی سمتوں میں بھاگتے ہیں۔ تو نہ جانے کیسے پھر برآمدے میں ٹکرا جاتے ہیں۔ آخر بڑی مشکل سے آپ اپنے

اپنے ہونٹ پونچھتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں۔۔۔

مہمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی الوالانش بھی آتی ہے جس کا نام بچے ہیں اور جو شکل ہی سے مہمان کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ بچوں سے پیار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ پرماتما کے راج بھوت ہوتے ہیں لیکن اس کا کیا کیجئے کہ چھوٹے نلی چوچو کی ناک بہہ رہی ہے، جسے وہ ہمیشہ اپنی قمیص کے کف سے پونچھتا ہے۔ بڑا باہر سے کھیلتا ہوا آتا ہے اور اپنے کیچڑ سے لت پت پاؤں دیوان پر رکھ دیتا ہے ان کی ماں رسمی طور پر انہیں ڈانٹتی ہے لیکن آپ کہتے ہیں۔۔ بچے ہیں، بھابی۔۔۔ یہ تو ایسے ہی کریں گے جیسے۔ بچے کرتے ہیں۔ انہیں روکنا بڑی غلطی ہے" یہی نہیں، آپ اپنے علم کے زور پر سے بتاتے ہیں کہ بچے تھوڑی بہت توڑ پھوڑ نہ کریں تو ان میں تخریبی جذبے دب جاتے ہیں اور اس وقت نکلتے ہیں، جب وہ بڑے ہو جائیں لیکن یہ بات تو آپ بھی نہیں جانتے کہ آج کل کے بچے، آپ کی سب بات سمجھ رہے ہیں۔ ابھی آپ نے کھانے کے لئے لقمہ منہ میں بھی نہیں رکھا کہ اڑڑڑڑ دھڑام کی آواز آتی ہے۔ آپ سب بھاگتے ہوئے بغلی کمرے میں پہنچتے ہیں کہ لینن کا بت جو آپ لینن گراڈ ہی سے لائے تھے۔ زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور نلی چوچو پاس کھڑا کچھ فاتحانہ کچھ مجرمانہ انداز سے ہنس رہا ہے۔ ہے ہے ہے ہے۔۔۔ اب ماں دکھاوے کے لئے تھپڑ مارتی ہے، لیکن صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی پھولوں کی چھڑی سے

اس کی نواضح کر رہی ہے۔ اب آپ ہیں اور آپ کی بیوی جو اسے "چھڑا" رہے ہیں آپ کا اتنا کہنا تو کہنا ہے۔ سالے کو ننگا کر کے ٹکٹکی لگا کر وہ بید مارو کہ چمڑی اُدھڑ جائے۔ لیکن اُوپر سے آپ یہی کہتے ہیں "کیا ہوا بھابی" بچّے تو توڑیں گے ہی۔ میں نے آپ سے کہا نہیں تھا؟ ....

چھوڑو اب مار ہی ڈالوگی معصوم کو؟ پھر چھڑانے کی بجائے اِسے آگے... دھکیلتے ہوئے آپ کہتے ہیں "روس والے اب مجھے REACTIONARY سمجھنے لگے ہیں۔ ورنہ میں ایک اور بُت ماسکو سے لے آتا"

بجلی مجھ پر اس وقت گرتی ہے جب میرا مہمان اور اس کی بیوی دونوں مِل کر بچے سے کہتے ہیں "نمستے کرو، نمستے کرو انکل کو ... ارے کنگ"

اب کنگ ماں کی دھوتی پکڑ کر اس کے پیچھے چھُپنے لگتا ہے اور مشکوک انداز سے آپ کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی ادا سے کہتا ہے "نائیں ...."

بچے کا باپ اسے پکڑ کر، سامنے لاتے ہوئے کہتا ہے "ارے، نمستے کر سالے انکل چاکلیٹ دیں گے"

جبھی ماں اتراتی ہے "میرا کنگ چاکلیٹ بہت پسند کرتا ہے"

آپ فوراً کہتے ہیں "چاکلیٹ لے دوں گا بیٹے۔ اور ٹافی بھی" حالانکہ اتنا کہنا ہے نخوڑا ... پوٹاشیم سائنائیڈ بھی۔ میں پھر شروع ہوتا ہوں "تمہارے لئے غبارہ لاؤں گا۔ کنگ ابہت بڑا غبارہ نمستے ...."

" ہی ہی ہی ۔ منشتے !" آخر کنگ کہتا ہے۔

پھر اس کا باپ شروع ہوتا ہے ..... " یار کنگ، انکل کو اے بی سی ڈی سُناؤ۔"
کنگ انکار میں سر ہلا دیتا ہے اور پھر ماں کے پیچھے چھپنے لگتا ہے۔

" ارے سناؤ نا، شرما کیوں رہے ہو؟" ماں اسے پھر سامنے لاتے ہوئے کہتی ہے۔

" ہاں"، بس کہتا ہوں " کار لے دوں گا"

جب کنگ فارم میں آتا ہے اور کہتا ہے " چابی والی کار نا ئیں، انکل! وہ والی
اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اسٹیرنگ وہیل کی شکل بناتا ہے۔

آخر میرے وعدہ کرنے پر وہ شروع ہوتا ہے۔

" اے ... بی ... سی ... ڈی ... اِی ... ہی ہی، مجھے سو، سو آیا ہے، ممی"

" ارے! ممی یوں اظہار کرتی ہے، جیسے کوئی ان ہونی بات ہو گئی۔ " چل اندر"
اور وہ وہیں سے اس کا ازار بند کھولتی ہوئی کنگ کو باتھ روم کی طرف لے جاتی ہے
لیکن جاتے میں یہ بھی کہہ جاتی ہے " بالکل باپ پہ گیا ہے، کام کے وقت سو، سو!..
باپ ہنستا ہے، میں بھی ہنستا ہوں۔ میری بیوی ہنستی ہے۔ ساری دنیا ہنستی ہے۔

" ہمارا مہمان پھر شروع ہوتا ہے " بڑا ذہین ہے اپنا کنگ!"

" کیوں نہ ہو"، میں اتفاق کرتا ہوں " ذہین ماں باپ کی اولاد ...." حالانکہ میرا

انتا کرن کہتا ہے۔ گدھے کا بچہ گدھا ہی ہوگا، گھوڑا کیسے ہو جائے گا؟

جبھی ایک طرف سے کوئین چلی آتی ہے انگریزی GENDER کے سب قانون جھٹلاتی ہوتی کیونکہ وہ کوئین ہونے پر بھی کنگ کی بہن ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ہر دلعزیزی دیکھتی اور جلتی رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ کسی پتری پاٹھشالہ میں پڑھتی ہے، سامنے آتے ہی وہ، بنا کسی فرمائش کے ایک پرانا بے سُرا سا گانا شروع کر دیتی ہے۔

"ہیئے دیائے: ہم سبھوں کو شدھتائی دیجئے۔۔۔۔"

میں بھجن سُنتا ہوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے اپنی نانی یاد آجاتی ہے۔ جو بہت ہی شدھ ہے۔۔۔ میں اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے کوئین کو بیچ ہی میں ٹوک دیتا ہوں اور کہتا ہوں۔۔۔ "واہ، کیا گلا پایا ہے۔۔۔ بڑی ہوگی تو لتا منگیشکر سے کم کیا ہوگی؟ اور میرے انتا کرن سے آواز آتی ہے رمنیڈک کی اولاد!

لیکن کوئین بدستور گا رہی ہے۔ انترہ پہلے اور استھائی بعد میں۔ اس سے بھجن اور بھی موثر ہو جاتا ہے۔

"ایسی کرپا اور انوگرہ ہم پہ ہو پرماتما"

چونکہ وہ بچی ہے اس لئے بھلائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتی اور بڑی مُرتا سے پرارتھنا کرتی ہے جس سے وہ پرانا اور فرسودہ گانا نیا اور ماڈرن ہو جاتا ہے کہ

دُور کر کے ہر بھلائی کو بُرائی دیجئے!

اتنے میں کنگ فارغ ہو کر چلا آتا ہے اور کوئین کو گاتے دیکھ کر شروع ہو جاتا ہے۔ "میں بھی سُناؤں گا اردو کا سبق۔"

"ارے سناؤ، سُناؤ کنگ... یار کنگ تم تو...." ہم سب کہنے لگتے ہیں۔

اب کنگ ایک ہی سانس میں سبق سُنا جاتا ہے۔

"بچھو سے کسی نے پوچھا۔" تو جاڑے میں باہر کیوں نہیں آتا؟ بچھو نے کہا....

گرمیوں میں میری کونسی خاطر ہوتی ہے جو جاڑے میں بھی باہر آؤں؟

اور پھر کنگ یک بارگی اُلٹا سانس لیتا ہے ہا!

آخر ایک دن ہمیں آناً فاناً پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مہمان جانے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ پہلے ہی سے ہمیں اپنے سُبکدوش ہونے کی خبر دے دیتے ہیں۔ بلکہ کچھ یوں کہ اس سُہانی صبح کو ہمارے پاس آتا ہے۔ محبت بھرا ہاتھ ہمارے کان پر رکھ دیتا ہے اور آہستہ آہستہ خود سرکتا، ہمیں سرکاتا ہوا، بالکونی کی طرف لے جاتا ہے اور کھُسر پھُسر کے انداز میں بات شروع کرتا ہے "بات یہ ہے، میں نے بینک میں ایک چیک ڈالا تھا...." میں ایکا ایکی سب سمجھ جاتا ہوں اور اُسی وقت پوچھتا ہوں "کتنے روپئے چاہیئیں آپ کو؟"

وہ کہنے لگتے ہیں "بس دِلّی پہنچتے ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔"

اب میں اپنے مہمان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ جو آدمی مجھے پیسہ لوٹانے کی بات کرتا ہے، میرا اُس کے مُنہ پہ طمانچہ مارنے کو جی چاہتا ہے۔ خیر وہ تو میرا اتنا کرن ہے۔

بس اسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں "ارے یار، تم نے آتے ہی کیوں نہ مانگے.. کتنے چاہئیں؟"

"زیادہ نہیں،" وہ کہتے ہیں "یہی تین اِک سو روپے"

میں فوراً بھاگا ہوا اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی کے پاؤں پہ سر رکھ دیتا ہوں اور اس سے تین سو روپے لاکر مہمان کو دے دیتا ہوں۔ وہ کچھ کھسیائے ہوئے انداز میں مجھے تکلیف دینے کی معذرت چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ میں اندر سے کتنا خوش ہوں۔ بھلا مہمان، اس کے لاؤ لشکر۔ کنگ، کوئین، پرنس، رائل اور اس کے پورے شاہی خاندان سے چھٹکارا پانے کی تین سو روپیہ بھی کوئی قیمت ہے؟

بیوی یا بیماری

جب سے دُنیا بنی ہے بیویاں بیمار ہوتی آئی ہیں۔ چنانچہ میرے حصّے میں جو بیوی آئی وہ بھی بیمار تھی۔ ہے!

بیویاں اپنی بیماری کی سب سے بڑی وجہ اپنا شوہر بتاتی ہیں۔ ورنہ مائیکے میں وہ بھلی چنگی تھیں۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں۔ البتہ بیچ بیچ میں اس بات پر بھی مچلتی تھیں کہ ذرا بیمار ہو کر دیکھا جائے۔ چنانچہ اسی اُمید وار خوشی میں ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ ریشمی کپڑے پہنے اور جڑاؤ زیوروں سے آراستہ سُسرال کی چوکھٹ پہ پیر رکھتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیماری کا عمل شروع ہو جاتا ہے نوآموز (شوہر) دولہا دلہن کے آتے ہی اسے تشنج میں دیکھ کر سخت گھبراتا ہے۔ اور بھاگا ہوا بھابی یا ماں کے پاس پہنچ جاتا ہے جو اس کے پھوہڑ پنے پہ خوب ہنستی ہیں چونکہ اسے کسی دوسرے کا منہ تو ملتا نہیں اس لئے اپنا سا منہ لے کر

لوٹ آتا ہے۔ شادی کے پہلے ہی چند دنوں میں میاں کو دکھا کرنے کے لئے بیوی تندرستی کے دن یعنی کنوارپنے اور میکے کو یاد کرکے رونے لگتی ہے جہاں وہ اپنی نیند سوتی اور اپنی ہی نیند جاگتی تھی۔ اور اب یہاں اسے پرائی نیند سونا پڑ رہا ہے اور پرائی ہی نیند جاگنا۔ البتہ آنسو خالص اس کے اپنے ہوتے ہیں اور وہ کبھی دولہا کے آنسو نہیں روتی۔

پھر وہ دن آجاتے ہیں جب وہ واقعی طبّی نقطہ نظر سے CLINICALLY بیمار ہوتی ہے۔ میاں ایک کی جگہ دس دوائیں لاتا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے جو بیوی سے کچھ سوال کرتے ہوئے ضمناً میاں سے بھی کر جاتا ہے اور اُسے سخت شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بیوی کی بیماری ڈاکٹر کو نبض دکھانے یا اسے دوائیں لاکر دینے سے نہیں جاتی۔ وہ اس وقت تک رہتی ہے جب تک میاں دوا اپنے ہاتھ سے نہیں پلاتا۔ وہ روٹھتی ہیں۔ بڑے بڑے مُنہ بناتی ہے۔ میاں پیار کا دھوکا دیتا ہے، یاد ھو کے بس پیار کر جاتا ہے۔ یہ تھو تھو کرتی ہیں۔ وہ فوفو کرتا ہے۔ آخر آدھی دوا اندر جاتی ہے آدھی باہر گرتی ہے اور کچھ دیر کے بعد جناب بیوی کا ذائقہ ٹھیک ہوتا ہے تو میاں کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے ایک ادا سے کہتی ہے "اے، تمہارے ہاتھ سے تو میں زہر بھی پی لوں،، اور میں یہاں اپنے شوہر بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ بیوی کی اور بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی سفید، کالا یا ہر رنگ کا جھوٹ سمجھیں ورنہ پھانسی ہو جائے گی۔

اگر بیویاں آس پاس نہ ہوں یا ہوں تو ہمیشہ کی طرح اپنی ہی بات بس کسی دوسرے کی نہ سُنیں تو میں آپ کو بتاؤں۔ بیویاں دراصل بیمار نہیں ہوتیں۔ وہ یونہی تھوڑے سے نوٹس پر بیمار ہو کر دکھا دیتی ہیں۔ اس بات کو جاننے کے لئے کہ ان کی بیماری کے ساتھ ان کا ہونا سونا کتنا بیمار دکھائی دیتا ہے۔ کتنے دکھ اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ جو فعل بیویوں کی لغت میں محبت کا دوسرا نام ہے اگر میاں کے چہرے پر بیوی کی بیماری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیں تو وہ اسے نہایت کمینہ اور رذیل آدمی سمجھتی ہیں۔ لیکن دل میں خوش ہوتی ہیں اور کہتی ہیں مرد ہے!" اگر وہ کہیں ہمدردی کا اظہار کرے، کروٹ کروٹ ساتھ مرے تو یوں دیکھنے میں خوش نظر آئیں گی لیکن اندر سے کہیں گی "زنخا ہے موا"۔ میں بڑی بیماری کی بات نہیں کرتا۔ جو کہ بیوی خود ہوتی ہے، ان چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا ذکر کر رہا ہوں جو دراصل کوئی وجود نہیں رکھتیں اور جو مرد کو اکسانے کے لئے بیوی دن رات پیدا کرتی ہے۔ خالص بیوی ہو گی تو روز سویرے اٹھ کر شکایت کرے گی "آج میرا سر کچھ بھاری ہے"، پھر وہ ناک سکیڑے گی۔ ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لے گی! اور اس کی یہی بات، آپ کو بیماری لگے گی۔ آپ خود بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ اس کی وجہ آپ خود ہیں۔ آپ بڑی محبت، جو لفظ اردو میں لکھتے وقت حجت معلوم ہونے لگتا ہے کے ساتھ کہیں گے "اوہو ایسپرین ہے گھر میں؟" چنانچہ ایسپرین ہو گی۔ کوڈا پائرین بھی ہو گی۔ مگر وہ کھائیں گی نہیں۔ آپ سوچنے لگیں گے۔

ان کا کچھ نہ کچھ بھاری ہی رہتا ہے۔ سر نہیں تو پیر ہی سہی۔ پھر بیوی کے بدن میں ایک حصّہ ہوتا ہے جسے وہ کمر کہنے پر مسر ہوتی ہے یاد رہے یہ عورت کے بدن کا وہ حصّہ ہے جس پر ہماری شاعروں اور نثر نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور نعلی کے مضمون میں اسے نازک پتلا ہونا تو کیا نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے مگر بیوی کے سلسلے میں وہی کمر حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے ان شعروں کو اور بیوی کی کمر کو ساتھ رکھ کے دیکھا جائے تو وہی چیز اچھا خاصہ کمرہ معلوم ہونے لگتی ہے وہ ہوتا یا ہوتی تو بدن ہی کے ساتھ ہے مگر آپ کو اسے ٹوٹا ہوا تصوّر کرنا پڑتا ہے بیویاں اتنی سادہ سی حقیقت نہیں جانتیں کہ میاں کو ان کے بدن کے ہر حصّہ سے ہمدردی اور پیار ہوتا ہے مگر کمر سے نہیں کیونکہ مرد کی فطرت اسے معدوم ہی دیکھنا چاہتی ہے۔ بہرحال بیوی کی ٹوٹی ہوئی یا ٹوٹتی ہوئی کمر پہ کوئی لیپ، کوانٹی فلاجیٹین اثر نہیں کرتا اور نہ درد شقیقہ وعصابیہ NERVOLGIA دور کرنے والی گولیاں لیکن چونکہ اب تک آپ بھی خالص میاں ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کہتے ہیں ”بنّو آج تو تم بڑی حسین لگ رہی ہو“ پھر کہاں کی کمر اور کہاں کا درد؟ حقیقت یہ ہے کہ کمر درد کے لئے اس سے بہتر دوا آج تک سائنس ایجاد نہ کر پائی۔

بس جانتا ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں بیوی کی بیماری پہ ہنسنا اچھی بات نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ وہ رونے بھی تو نہیں دیتیں۔ جیسے ان کا میاں کوئی جوتشی

ہے۔ رمّال ہے یا ولی اللہ۔ اور جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ بیوی کی بیماری کے ایام میں میاں جنّت اور دوزخ کے بیچ عالم برزخ میں کہیں اٹکا لٹکا ہوتا ہے۔ چہرہ دیکھو تو غم کے گھٹاٹوپ بادل چھائے ہیں۔ دل کو کرید و تو ایک ہنسی ہے جو اس کان سے اُس کان تک پھیلتی جارہی ہے اور مُنہ سے ناف تک زبردست جھٹکے دے رہی ہے۔

یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ کائنات میں مادہ نر سے زیادہ سخت جان ہوتی ہے اور اس سے زیادہ لمبی عمر کی متوقع۔ یہی وجہ ہے کہ مسکین بیوی نہایت بے فکری کے عالم میں دن کو پچیس تیس مرتبہ تو ضرور کہتی ہے "ہائے میں مرگئی" لیکن یہی بات اپنے میاں کو نہیں کہنے دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ اگر اس نے کہا "میں مرگیا" تو وہ سچ مچ مرجائے گا! جلدی یا آسانی سے مرجانے کی سزا قدرت نے مرد کو شاید اسی لئے دی ہے کہ اس کا جنسی نظام عورت کے پرُپیچ جنسی سلسلہ کی بہ نسبت بہت سیدھا اور سادہ ہے۔ غالباً اسی لئے بیویاں میاں کی مسلسل تندرستی کی حاسد ہو جاتی ہیں کیونکہ ان مردوں کو تو کچھ ہوتا ہواتا نہیں۔ حالانکہ اس بے چارے کا قصور ہے تو صرف اتنا کہ پہلے وہ مرد بنا اور دوسرے ان کا شوہر۔ وہ میاں کو دیکھ دیکھ کر یونہی کباب ہوتی رہتی ہیں اور کسی طرح اس کا بھلا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے وہ مرد کے رنڈوا ہوجانے کو اپنے بیوہ ہوجانے سے اچھا سمجھتی ہیں۔

بیویوں کو بہت سی بیماریوں میں سے کچھ کہنے کے لائق ہوتی ہیں اور کچھ نہ کہنے

کے لائق۔ میاں کو اس بات کی سمجھ بہت دیر کے بعد آتی ہے اور اس کی سمجھ کا سلسلہ معمول کی سیدھی سادی آزمائش اور غلطی، بلکہ حماقت سے شروع ہوتا ہے وہ اپنی سادگی میں بیوی سے براہِ راست سوال پوچھ بیٹھتا ہے اور پھر اسی وقت ڈانٹ کھا کر سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی زبان اگر وہ بے حد خفا نہ ہوں تو بالواسطہ ہوتی ہے۔ وہ تشبیہہ اور اشارے کی جان ہے۔ مثلاً حال ہی کی بات ہے میرے ایک دوست نے وطن میں اپنی بیوی کو لکھ بھیجا "اب کے جینے رہ گئے" تو بیوی نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف خط کے ایک طرف تین چھوٹے چھوٹے دائرے بنا دیئے۔ گویا عورتوں کی زبان میں اس ابجد کا کوئی دخل نہیں جسے ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں وہ اگر اس ابجد کو جانتی بھی ہوں گی تو اسے استعمال کرنا اپنی شان کے شایان نہ سمجھیں گی۔ ان کی زبان اب تک قدیم مصری خط تصویر HIEROGLYPHICS سے ملتی جلتی ہے جسے مصر کے لوگ تو کب کے چھوڑ چکے مگر ہماری بیویاں اب تک کلیجے سے لگائے پھرتی ہیں اور وہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے جس کی شکل بیوی ہی کی طرح ہوتی ہے، مگر خصلت ایک دم الگ۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں جس کی بیماری اور بھی ٹیڑھی اور ناقابل علاج ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامتِ اعمال عیادت کے لئے

چلے بھی جائیں تو آپ صاحب خانہ سے پوچھتے ہیں.... "کیسی طبیعت ہے۔
گھر میں ؟" "اب تو اچھی ہے بھگوان کی دیا سے "
"کیا تکلیف تھی ؟"

اس پر وہ دوسرے کی بیوی کا میاں یا دوسرے میاں کی بیوی آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں ۔جیسے آپ کوئی گھنٹہ گھر ہیں اور شہر کے چوک میں نصب ہیں ۔دوسرے کی بیوی ہونٹوں کے بیچ مسکراتی ہوئی منہ پرے کر لیتی ہے اور اس عمل میں اپنی بیوی سے بھی پیاری لگتی ہے ۔البتہ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتا ہے.... "زنانہ تکلیف.... " مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجئے ۔آپ کی سٹی گم ہو جاتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ بیوی کی بیماری شاید بیوی سے الگ کوئی چیز ہے مگر اس وقت تک آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے اور جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کا نام تجویز کر کے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔دہلیز ہمیشہ کی طرح ایک فٹ اوپر اٹھ کر آپ کو ٹھوکر لگاتی ہے مگر آپ اپنے آپ کو اسی قابل سمجھ کر سنبھل جاتے ہیں ۔سڑک پر پہنچتے ہیں تو خیال آتا ہے مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام لینا چاہیئے تھا چنانچہ نصیحت کی غرض سے آپ لوٹتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو "بکواس بند کر" کہتے ہوئے کسی اور و افتکار کے ہاں چل دیتے ہیں جہاں خوش قسمتی سے کوئی میاں بیمار ہے۔

شاذ ہی کوئی بیوی ہو گی جو مہینے میں چند دن بیمار نہ ہوتی ہو۔ اس میں میری بیوی یا آپ کی بیوی کی بات نہیں ۔دنیا جہاں کی ، جملہ بیوی جات کا قصہ ہے ۔اِن

ایام میں وہ کچھ یوں لیٹی ہوں گی جیسے انہیں ہیضہ ہو گیا ہو وہ عاشق کی طرح زرد اور معشوق کی طرح دھان پان نظر آ رہی ہیں۔ چڑچڑی اس قدر کہ بات بات پر میاں کو کاٹنے دوڑتی ہیں۔ حالانکہ اس غریب کا قصور نہیں، گری گدھے پر سے ہیں اور غصہ کمہار پہ اتار رہی ہیں۔ جو میاں اب تک شکل سے دکھائی دینے لگا ہے۔ اپنے سڑی پن میں بیویاں بھول جاتی ہیں کہ اس بیماری ہی میں ان کی صحت ہے اگر کسی مہینے یہ چھوٹی بیماری نہ آئی تو بڑی آئے گی۔ پھر کھٹے کھٹے ڈکار آئیں گے۔ سر چکرائے گا۔ اُبکائیاں آئیں گی۔ ایک طرف بیماری پر غصہ آئے گا۔ دوسری طرف پورے بدن میں خوشی کی سنسناہٹ دوڑ جائے گی۔ میاں پوچھے گا مگر کبھی نہیں بتائیں گی۔ اشارے سے یہی کہیں گی کہ بس سمجھ جاؤ۔ میاں ایک طرف مجرمانہ اور دوسری طرف فاتحانہ انداز سے بیوی کی طرف متوجہ ہو گا اور تلافی مافات کے سلسلے میں بازار سے سیب اور ناشپاتیاں، قلاقند اور امرتیاں لا کر دے گا جنہیں لے کر بیوی خوش تو ہو گی۔ مگر بیماری سے اپنا ازلی رشتہ قائم رکھنے کے لئے بڑے سلیقے سے ان سب چیزوں کو طاق پر رکھ دے گی، جو لکڑی کا نہیں نسیان کا بنا ہوتا ہے وہ شربت روح افزا کی جگہ جل جیرے کی فرمائش کرے گی۔ گلاب جامن کی جگہ گول گپے اور آم شریفے کی جگہ چولہے کی مٹی کھائے گی مرد کو جب بڑی بات کہنا ہوتی ہے تو وہ خاکم بدہن سے شروع کرتا ہے لیکن بیوی ہے کہ اچھی خبر سنانے سے پہلے منہ میں خاک جھونک لے گی۔ اگر میاں خفا ہو کر کوئی بات کہہ دے تو یہ بیٹھی بیٹھی

کھڑی بولی میں صلواتیں سنائے گی۔

بیوی کی ماہانہ بیماری کی نوعیت الگ ہے اور سالانہ کی الگ۔ پہلی قسم کی بیماری میں میاں کے لئے تھوڑی سی تسکین کی گنجائش ہے لیکن دوسری میں بکسر نہیں۔ اسے سال بھر یہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ بڑے افسر نے کہیں اس کے کیریکٹر شیٹ پہ اُلٹا سلٹا ریمارک لکھ دیا یا وطن سے باہر اس کا ٹرانسفر کر دیا۔ اب ایک گھر یہاں ہے دوسرا باہر بنانا پڑے گا۔ مہنگائی کا زمانہ۔ ان دو گھروں کا خرچ کہاں سے لائے گا۔ آخر وہ اپنے افسر کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور کچھ اپنے آپ کو سمجھاتا ہے اور پھر وہ دن آجاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو زچہ خانے کے باہر ٹہلتا ہوا پاتا ہے۔ دے سگرٹ پہ سگریٹ پیتا ہے نہ اُٹھ سکتا ہے نہ بیٹھ سکتا ہے اور بیویاں ہیں کہ اپنی جسمانی تکلیف کے سامنے میاں کی روحانی تکلیف کو کوئی بات ہی نہیں سمجھتیں۔ یہاں کے لئے یہی تکلیف کیا کم ہے کہ زچہ خانے کے باہر وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا گدھا سمجھتا ہے حالانکہ اس کے پاس ہی اور بھی بہت سے گھوم رہے ہوتے ہیں اس احساس کا بیوی کے نزدیک کوئی مول نہیں؟ بیوی تو مزے سے ایک بچہ پیدا کر رہی ہوتی ہے۔

آخر عزرائیل کی بہن نرس لیبر روم سے تھوتھنی نکالتی ہے اور میاں سے مختصر سا خطاب کرتی ہے "IT'S BOY" اور میاں اپنی گھبراہٹ میں نرس سے کہتا ہے "CONGRATULATIONS سِس"..... اس سے پہلے کہ میاں

بیوی کی حالت پُوچھ سکے نرس جا چکی ہوتی ہے۔

اب میاں ہمت کرتا ہوا اندر جاتا ہے اور بیوی کو اس جانکاہی کے بعد آرام سے سوتا ہوا دیکھتا ہے اس کا سارا اندرابل کر باہر آجاتا ہے مگر وہ یہ نہیں جان پاتا کہ اب کیا کرے؟ ہنسے یا روئے؟ وہ ہنس اس لئے نہیں سکتا کہ خدا اور عورت کے درمیان عظیم سازش کا ایک اور شکار چلا آیا۔ اور رو اس لیے نہیں سکتا کہ اس کی اپنی طرح کا ایک اور گدھا پیدا ہو گیا جو بڑا ہو کر ضرور محبت میں مبتلا ہو گا اور پھر شادی کر کے زندگی بھر دوائیں ڈھوئے گا۔ چنانچہ اس وقت میاں کو بھی، ڈاکٹر پرچی پہ کچھ دوائیں لکھ کر دیتا ہے اور میاں بیوی کو کسی چچی یا پھوپھی کی تحویل میں دے کر خود بازار سے دوائیں خریدنے نکل جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو بیوی جاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ شکوہ شکایت کی نظر سے میاں کی طرف دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔" اس دکھ کی دنیا میں کوئی ہے؟" لیکن میاں اب تک جان چکا ہوتا ہے اس لئے دواؤں کا بنڈل کھولنے کی بجائے وہ کوئی اور ہی پیکٹ کھولتا ہے۔ جس میں سے گلابی رنگ کی نہایت خوبصورت ساڑی نکلتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور ڈبیہ جس میں سے طلائی گھڑی برآمد ہوتی ہے اور میاں آنکھ میں محبت اور تاسف کے آنسو لئے ایک الٹی رکشابندھن کی شکل میں گھڑی بیوی کی کلائی پہ باندھ دیتا ہے اور ساڑی اس کے قدموں پہ نثار کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے:

"بنو یہ رشوت ہے، مول نہیں"

اور بیوی کے چہرے پہ پھر سے ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے جو ارگنڈی اور لائی سول وغیرہ کبھی نہیں لا سکتیں۔

یہ ہم شوہر بھائیوں ہی کی ہمت ہے کہ بیماریوں کے اس پٹارے کو جسے بیوی کہتے ہیں محبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے منشی پریم چند کا ایک افسانہ یاد آتا ہے جس میں ایک بیوی اپنے نکمے، نکھٹو اور سادہ لوح میاں کا رونا روتی ہے اور آخر اس بات پر حیران ہوتی ہے کہ اس کی سب ایسی باتوں کے باوجود وہ کہیں آدھ گھنٹہ بھی لیٹ ہو جاتے تو اس کی ساری کائنات الٹ جاتی ہے بجنسہٖ یہ بات میں اپنی بیوی کے سلسلے میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کے سارے لڑائی جھگڑے سے فساد اور گوناگوں بیماریوں کے باوجود میں سرِ شام اپنے آپ کو اس کی تحویل میں پاتا ہوں اور پھر میرے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے ساتھ ہوا تھا۔

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

میرا یار کرشن چندر

کسی جنّتی شخصیت پر لکھنا آسان کام نہیں۔ ایک تو اس لئے بھی کہ اُس کے بیچ سے اُٹھ جانے کے بعد ایک ٹھوس، مزاحمت کرنے والی، مادی حقیقت پر ماورائی غلاف پڑ جاتا ہے اور جیتے جاگتے انسان کی بجائے وہ اُس کا ہیولا نظر آنے لگتا ہے۔

کوئی انسان تمام تر اچھا نہیں ہوتا، نہ کلیتہً بُرا ہوتا ہے بلکہ انسان ہونے کی دلیل ہی یہ ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ٹکراؤ میں آئے کہیں مار دے، کہیں مار کھائے۔ کبھی وہ ہمیں انقلابی دکھائی دے، کبھی سماجی طرز پر ایک مصلح اور کبھی صرف جسم میں جیتا جاگتا عام گوشت پوست کا انسان سب خوبیوں اور خامیوں کو سموئے ہوئے۔ کبھی وہ بڑا سخی اور آدم دوست معلوم ہو اور کبھی نہایت خود غرض اور شاطر۔ اور جو لوگ زندگی کو سمجھتے ہیں

وہ جانبداری کے احساس سے اُٹھ کر انسان کا غالب رنگ دیکھتے ہیں۔

کرشن ایک انسان تھے۔ دل کے ہاتھوں مجبور۔ آخری چند برسوں میں انہیں دل کے جو دورے پڑے، اُن کا حساب تو ہمارے پاس ہے لیکن دل کے وُہ دورے، جن کا حساب انہی کے ساتھ گیا؟ دل کی ہر کسمساہٹ تو تحریر میں نہیں آتی اور نہ لائی جا سکتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جذبے جو تتلیوں اور پریوں کی طرح سے ناچتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے خوف اور خدشے جو (GNOMES) بن کر راتوں کی نیند حرام کر دیتے ہیں اور زندگی کافکائی (KAFKA) ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر کی شخصیت میں جمع تفریق کے بعد اثباتی باتیں زیادہ اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہ کہ وہ ایک اچھی روح تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ہسپتال میں پڑے وہ ایک بار کلینیکل طور پہ چل دیتے ہیں، لیکن ڈاکٹر کے ایک ٹیکے نے جان کے بدن میں دھڑکن پیدا کر دی صوفیوں کی زبان میں وُہ بالا سے عالم سفلی میں لوٹ آتے۔ اس عارضی موت میں انہوں نے کیا دیکھا، اس کے بارے میں سلمیٰ، اُن کی بیگم بیان کرتی ہیں۔۔۔ "کرشن نے کہا کہ میں تو کسی شاندار مرغزار میں تھا۔ جہاں خوشی ہی خوشی تھی اور سکون ہی سکون۔ اور روشنی کی صورت میں ایک جمال جس کے نظارے سے رُوح دھلی جا رہی تھی۔ پھر نا معلوم مجھے کیوں وہاں سے بُلا لیا گیا؟ ڈاکٹر سے کہو کہ ایک بار پھر مجھے وہی ٹیکہ لگا دے جو پہلے لگایا گیا تھا۔۔

میں انسان کی اندرونی زندگی کا سائنسی طریقے سے قایل ہوں۔ یہ EXTRA SENSORY PERCEPTION) کی باتیں محض ڈھونگ نہیں، کیونکہ مجھے خود ان

کا تجربہ ہے۔ سائنس نے ابھی تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ دماغ کی اُن پرتوں تک پہنچ سکے۔ جن کے بیچ دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں۔ روح اندر کے مانسر دور میں نہاتی، چھینٹے اڑاتی ہے اور اپنے آپ کو سب آلودگیوں سے پاک کر لیتی ہے۔ جہاں گلزار ہیں، مرغزار ہیں، حوریں ہیں اور اپسرائیں جو آپ کا سواگت کرتی ہیں۔ مذکورہ باتیں میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کرشن چندر کی دُنیا زندگی میں بھی وُہی تھی۔ جس پہ اکثر حادثات کے سائے پڑتے تھے۔ ورنہ ہواؤں، خوشبوؤں، کشمیر کی وادیاں اور اُن میں گھومتی ہوئی چرواہیاں نکھار کے ساتھ اُن کی تحریروں میں کیوں آتی تھیں؟ کرشن ایک اچھی رُوح تھے۔ کیونکہ اختلافات کے باوجود وہ ہر ادیب سے پیار کرتے تھے۔ بلکہ اُنہی کی وجہ سے تھا کہ ہم رل بیٹھتے تھے۔ انجمن بناتے تھے۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ کرشن چندر خود اپنی بات میں ایک انجمن تھے۔

رہی اُن کی تحریروں کی بات تو وُہ ایک بہت بڑے سٹائلیسٹ تھے جو بات اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔ قلم کی اس قدر روانی دو وجہ سے ہوتی ہے ایک تو یہ کہ کسی کو اندرونی طور پر یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اُسے تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ کہنا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اچھے اور بُرے تجربات کی وجہ سے فنکار کے دِل میں ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے، جسے وہ اپنے فن کی مدد سے جلد سے جلد جھٹک دینا چاہتا ہے۔ کرشن چندر میں جذبات کی شدت بھی اور آپ جانتے ہیں کہ جب روح میں خیالات اس درجہ متلاطم ہوں تو گفتار کے اُسلوب پر قابو رہے

تو کیسے؟ اُسلوب کے ایک حِصّہ پر تو انہیں قابو تھا، مثلاً منظر کشی، تشبیہات، استعارے احساسِ جمال۔ لیکن یہ غائیت کا احساس ادیب کی تحریر کو بیانیہ بنا دیتا ہے۔ وُہ دلچسپ تو رہتی ہے۔ لیکن گریز کے نہ ہونے کی وجہ سے فن کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کاش وہ تھوڑا سا تورُ کے ہوتے۔ میرے نزدیک مڑ کر اپنے آپ ہی کا ہالہ دیکھنا اعلیٰ درجے کے ادب کے لئے ضروری ہے۔

بس اس سے زیادہ خراج اپنے یار کو اور کیا دے سکتا ہوں کہ اُن کی تحریرات کے شروع میں میں نے کتنا چاہا کہ کرشن کا قلم مجھے مل جاتے اور میری لُکنت دور ہو۔ ہم ایک دُوسرے سے اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں اور یہ جاننا اب میرا نہیں، آپ کا کام ہے کہ منٹو میری تحریریں کہاں چلے آتے، کرشن چندر کہاں اور عصمت کہاں؟ اور مجھے یقین ہے کہ میں بھی اُن کی تحریروں میں کہیں ضرور ہوں گا جس کی حد چاہے ایک ہی فقرہ ہو۔ بہرحال، یہ کتنا خوبصورت حادثہ ہے کہ اپندر ناتھ اشک، منٹو، کرشن چندر، عصمت، عباس، حیات اللہ انصاری اور ہمارے بہت سے شاعر ساتھیوں کا قافلہ ایک ساتھ چلا۔ اور وُہ قافلہ اب بھی اپنی کج کلاہی کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ منٹو نہیں رہے، کرشن بھی گئے۔ لیکن یہ دونو "تُرکِ غمزہ زن" اپنے بے شمار کارناموں کے ساتھ اب بھی ہمارے سامنے بیٹھے ہیں ؏

اے تُرکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای
در دیدہ ام خلیدہ و در دِل نشستہ ای

کولی واڑہ

کولی واڑہ مہاجرین کا ایک کیمپ ہے۔

یہاں انسان اپنے ارتقا سے برد آزما ہو رہا ہے۔ عورتوں نے کھپریل ڈال کر گھر بنا لئے ہیں۔ مزدوروں نے ٹین پھلنگ کے دوکانیں۔ کبھی کبھی کارپوریشن کے آدمی انہیں بے دخلی کی دھمکی دینے چلے آتے ہیں۔

اسّی سالہ رنگی رام ... ابھی ابھی بیدخلی سے بچنے کے لئے اس نے پانچ روپے کارکن کے ہاتھوں میں تھما دیئے ہیں ..... رنگی رام وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اُٹھنے کی کوشش میں ہمکتا ہے۔" ہے میرے رام جی" اور آخر لیمپ کے لئے لگی ہوئی رسّی کو پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔" کوئی بات نہیں" وہ کہتا ہے" ایک دن تو باقاعدہ دوکان ہوگی۔ اس میں ساڑھے تین سو کی رسد ڈال لوں گا ... چھ مہینے میں پانسو، سال میں آٹھ سو، ہزار کی ہو جائے گی۔ چند ہی برس میں سب ٹھیک

ہو جائے گا...."

ایک بیوہ اپنے "منحوس" بچے کو گھر میں چھوڑ کر رنگی رام کی دوکان پر سودا لینے آتی ہے اس کی قمیص کے نیچے کوئی محرم نہیں اور چھاتیوں سے گھس گھس کر قمیص میں دو سوراخ ہو گئے ہیں... وہ مسکرا رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں "جیسے تیسے بھی لالہ، آج کا دن تو گزر رہی گیا ہے۔"

دو بچے کھیلتے ہوئے دوکان کے سامنے سے گزرتے ہیں، ایک دوسرے کو کہہ رہا ہے "جب ہم لاہور میں تھے نا دیپو۔ اس سے بھی بڑے مکان تھے ہمارے.... ایک پشاوری ٹم ٹم بھی... اور کھانے کو ٹوکروں کے ٹوکرے مٹھائیاں ـــ"

یہ تہذیب ہماری... جس میں آج تک بچے ماضی، نوجوان حال اور بوڑھے مستقبل کی باتیں کیا کرتے ہیں!

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اوّل)	قرۃ العین حیدر
" " (حصہ دوم)	" "
آگ کا دریا	" "
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	" "
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	" "
زیرِ لب	صفیہ اختر
حرفِ آشنا	" "
گنجے فرشتے	منٹو
انارکلی	"
ٹھنڈا گوشت	"
کرنیں	شفیق الرحمٰن
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی
زرد پتے	خلیل جبران
پاگل	خلیل جبران
محبت اور جوانی	" "
ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
پھول کی تنہائی	" "
الٹا درخت	" "
محبت کی رات	" "
مضامین کرشن چندر	" "
لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
کلیاتِ جگر	جگر مرادآبادی
آتشِ گل	" "
کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
تلخیاں	
گلِ نغمہ	

مکتبہ اُردو ادب لاہور